دیکھ کبیرا رویا



اکرام لدھیانوی

دیکھ
کبیرا
رویا

- ناشر - خالد لطیف چوہدری
- طابع - آردو پریس لاہور
- زیبائش - تفضل ضیا
- سرورق - نوروز پریس لاہور

ادارۂ نو

- قیمت تین روپے چار آنے صرف
- اشاعت اول
- تعداد - گیارہ سو

دیکھ کبیرا رویا

اکرام لدھیانوی

★

ادارۂ نو۔ چوک مینار۔ لاہور

کوکو بہن کے نام

رنگی کو نارنگی کہیں بَنے دُودھ کو کھویا
چلتی کو گاڑی کہیں دیکھ کبیرا رویا

راولپنڈی - ۲۳ جنوری ۵۹ء

اکرام پیارے

آج معلوم ہوا کہ تمہارا کلاس فیلو اشرف ایک بڑا افسر بن گیا ہے - اشرف ایک منحوس اور پڑھاکو سا لڑکا ہوا کرتا تھا - اور تم اسی کے مقابلے میں اچھے خاصے ذہین طالب علم تھے - یہ الگ بات ہے کہ تم نے ہر امتحان میں تھرڈ ڈویژن حاصل کی ہے - تمہارا وہ لطیفہ مجھے نہیں بھولتا جب تم سے کسی نے پوچھا تھا کہ تم ہر بار تھرڈ ڈویژن کیوں لیتے ہو - تم نے جواب دیا "اسلئے کہ فورتھ ڈویژن کوئی نہیں ہوتی ---

اور اب جبکہ تم زندگی اور غم حالات کے امتحان سے دوچار ہو رہے ہو تو مجھے بار بار تم پر غصہ آ رہا ہے - اشرف تو تم کیا بنتے البتہ ادیب بن گئے ہو - اس سے تو اچھا تھا کہ تم ایک گھوڑی ٹانگہ لے کر کوچوان بن جاتے تاکہ شام کو گھر آتے ہوئے تمہاری جیب میں بہت سی ریزگاری ہوتی -

ڈوڈو سلام لکھواتا ہے

تمہارا

اماں

میں اور میری کتاب

میں اکرام لدھیانوی ہوں

اور میری کتاب آپ کے سامنے ہے۔ لیکن یہ تو آپ بھی جانتے ہیں۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہوا۔ میرا شمار ملک کے مایہ ناز ادیبوں میں ہوتا ہے۔ اتنا اور جان لیجئے کہ میرے پاس مایا ہرگز نہیں۔ اس پر ناز کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ

مایا کو مایا ملے کر کر لمبے ہات — تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھے بات

مجھے دیانت داری سے تسلیم کرلینا چاہیئے کہ میں نے تلسی داس گریب کو کبھی نہیں دیکھا۔ البتہ تلسی داس امیر سے مجھے اکثر سابقہ پڑا ہے لیکن اب تلسی داس مشرف بہ اسلام ہو گیا ہے، اور اس کا نیا نام ـــــ خیر نام میں کیا رکھا ہے۔ آپ اس کے کام سے کام رکھیئے وہ زمانہ اور وقت کے مطابق ہر کام کر لیتا ہے مگر وقت پر کام کبھی نہیں آتا۔ یوں تو وہ ہر دور اور ہر مقام پر پایا جاتا ہے لیکن وہ جو ہے نا تو بڑا بہروپیا ہے۔ اور اس کے ہزاروں روپ دیکھنے کے لئے آپ کو اگلے صفحات دیکھنا ہوں گے۔

اور جہاں تک تلسی داس گریب کا تعلق ہے مجھے کہنا پڑے گا کہ اگر میں آواگون کے مسئلہ کا قائل ہوتا تو آپ کو یقین دلا دیتا کہ اس کی روح راقم الحروف میں حلول کر گئی ہے اور وہ لوگ جنہیں محض اپنے حلوے مانڈے سے غرض ہے میری بات نہیں سنتے کیونکہ ان کا زیادہ وقت حلوائی کی دوکان پر بسر ہوتا ہے جہاں وہ روایتی ناناجی کی فاتحہ خوانی میں مصروف رہتے ہیں۔ اس لئے ان کی بات چھوڑیئے۔

اصل بات یہ ہے کہ مجھے ان صفحات پر کسی مستند ادیب

سے اپنا تعارف لکھوانا چاہیئے تھا۔ لیکن مجھ سے زیادہ مستند بھلا کون ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ میرے پاس کوئی سند نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں یہ فریضہ خود ہی سرانجام دے رہا ہوں تاکہ سند بھی رہے اور بوقتِ ضرورت کام بھی آئے۔

کام کی بات یہ ہے کہ میں نے کسی اَور کو تکلیف دینے کی بجائے اپنی شان میں خود ہی ایک عدد قصیدہ لکھنے کا فیصلہ کیا ہے لیکن ممکن ہے آپ قصیدوں کو ناپسند کرتے ہوں۔ ویسے بھی یہ زمانہ قصیدوں کا نہیں اس لئے یہ قصہ بھی چھوڑیئے۔

میں سوچ رہا ہوں قصیدہ نہ سہی تعارف ہی سہی آخر کچھ نہ کچھ تو مجھے اپنے بارے میں لکھنا ہی چاہیئے پھر خیال آتا ہے ممکن ہے آپ مصنف سے زیادہ تصنیف میں دلچسپی رکھتے ہوں۔

میری یہ تصنیف جس کا نام — دیکھ کبیرا رویا ہے۔ ان مضامین پر مشتمل ہے جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ چند مضامین ایسے بھی ہیں۔ جن کی اس سے قبل کہیں اشاعت نہیں ہوئی۔

مجھے ان مضامین کے سلسلہ میں یہی عرض کرنا ہے کہ یہ اس دور کی تخلیقات ہیں جو بہت تاریک تھا۔ اب تاریکی چھٹ رہی ہے

اور اُجالے کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ ان مضامین کو میری طرح یادگارِ پارینہ سمجھ کر قبول کر لیں۔

اکرام لدھیانوی

۱۳۔ انارکلی، لاہور

---

۵ فروری ۵۹ء

ترتیب

چلنی کا نام
لیڈر کے نام
چوہے کی وصیت
گلیاں اور بازار
اپنے نام ایک خط
بور کرنے والے
ہوٹلوں کا شہر

لیڈرومینیا۔
جو لوگ کچھ نہیں کرتے
مکتوب اندھیر نگری
ہونے والی بیوی کے نام
بیان حلفی
اک برہمن نے کہا ہے۔
رونے کا فن

O

چلتی کا نام

مجھے چلنے والی چیزوں کے بارے میں یہ بھی نہیں معلوم کہ ہمارے ہاں واقفیت چلتی ہے۔ خوبصورت سفارشی چلتے ہیں یا میلے کچیلے نوٹ چلتے ہیں اس لئے میں حتمی طور پر نہیں بتا سکتا۔ کہ چلتی کا نام سفارش ہے رشوت ہے یا گاڑی ہے۔

اے لوگو

بہت دنوں سے میرے ذہن میں یہ عنوان گھوم رہا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ میں ایک مضمون لکھوں گا۔ جس میں چلتی کے ہزاروں نام ہوں گے پھر ان چیزوں کا ذکر ہوگا جو مدتوں سے چل رہی ہیں۔ اس کے بعد ان چیزوں کی بات کروں گا جو چلتے چلتے اچانک رک گئی ہیں اور اب کسی عنوان چلنے پر آمادہ نہیں لیکن باوجود کوشش کے میں وہ مضمون نہیں لکھ سکا دراصل حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے ہیں میرے ذہن میں وہ عنوان گھوم رہا ہے۔ میں سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر گھوم رہا ہوں۔ یوں کہہ لیجئے کہ حالات کے پھیلتے اور سمٹتے ہوئے دائروں کے درمیان جو کچھ بھی ہے گھوم رہا ہے۔ چکر کھا رہا ہے اور میں شہر کی تنگ و تاریک

گلیوں سے کشادہ سڑکوں تک، چلتا رہتا ہوں۔ سوچتا رہتا ہوں اور میرے اِدھر اُدھر سب کچھ چل رہا ہے۔ لیکن میری چونکہ کچھ نہیں چلتی اس لئے آپ چاہیں تو چلتی کو گاڑی کہہ سکتے ہیں کیونکہ ان دنوں اپنے ہاں یہی دستور ہے۔ دستور کی بات کرتے ہوئے میں پاکستان کے دستور کا ذکر نہیں کروں گا۔ جس کے نام پہ یہاں سب کچھ چلتا ہے۔ اور چلنے دیا جاتا ہے۔

میں نے سوچا تھا کہ اس مضمون کے آغاز میں لکھوں گا کہ کسی زمانہ میں چلتی کا نام گاڑی ہوا کرتا تھا اور اب چونکہ چل چلاؤ کا زمانہ ہے اور ہمارے گرد و پیش کی ہر چیز تیزی سے چل رہی ہے کہیں سیاسی قلم گردس میں اقتدار کی محبوبہ کے ناز و ادا کا سکہ چلتا ہے کہیں دفتری نظام میں پرمٹ اور لائسنس چلتے ہیں کولمبو پلان کے تحت آنے والی کاروں سے چھٹے ہوئے لوٹوں والے کلرکوں تک اپنے وطن میں سبھی کچھ چلتا ہے اور میں چلتی کو بہر حال چلتی ہی کہنے پہ مجبور ہوں گاڑی نہیں کہہ سکتا۔

اس کے بعد میرا خیال تھا کہ چلتے چلتے اچانک بند ہو جانے والی چیزوں میں مال روڈ کی ڈنگا سنگھ بلڈنگ پہ آویزاں کلاک کا ذکر کروں گا جو ایک زمانہ سے سوا دس بجا رہا ہے۔ یوں تو اس ضمن میں راشن کی سپلائی

کا قصہ بھی آجاتا ہے ۔ جو اچانک بند ہوگئی ہے لیکن یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں اس لئے اسے یونہی چھوڑ دیجئے کیوں کہ جن لوگوں کی چلتی ہے وہ کسی کی نہیں چلنے دیتے اور راشن کی دکان کا "چلتی والوں" سے گہرا تعلق ہے بس اس تعلق پر روشنی ڈالنے کی بجائے میکلوڈ روڈ کے ایک سینما گھر کا آنکھوں دیکھا حال بھی اس مضمون میں لکھنا چاہتا تھا۔ اتوار کے روز میں اپنے ایک دوست کے ساتھ مذکورہ سینما میں سپیشل شو دیکھنے گیا۔ کھڑکی کے باہر لمبی قطار میں ایک بزرگ ان لوگوں پر خفا ہو رہے تھے جو قطار میں کھڑے ہونے کی بجائے دوسرے طریقوں سے ٹکٹ خریدتے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا آپ ہی انصاف کیجئے کہ ہم لوگ گھنٹوں قطار میں کھڑے رہتے ہیں۔ اور چند لوگ بالا ہی بالا ٹکٹ لے کر ہال میں جا بیٹھتے ہیں۔ آخر یہ کہاں کی انسانیت ہے۔ ابھی وہ یہیں تک کہہ سکے تھے کہ ان کا ساتھی خدا جانے کہاں سے دو ٹکٹ لے کر آگیا اور وہ قطار سے نکل کر اس کے پیچھے پیچھے چل دیئے اور جب ہم ٹکٹ خرید کر ہال میں داخل ہونے لگے تو گیٹ کیپر نے آدھا ٹکٹ ہمیں دینے کی بجائے اسی طرح اپنے پاس رکھ لیا۔ اور ہم سے کہا۔

"جائیے صاحب بیٹھ جائیے"۔

تب مجھے معلوم ہوا کہ تفریحی ٹیکس کا روپیہ ہضم کرنے کے لئے تنظیم اعتماد اور یقینِ محکم کے ساتھ ایسا کیا جاتا ہے۔ ایکسائز انسپکٹر سے سنیما کے مالکان تک سبھی کا خیال ہے کہ چلتی کا نام گاڑی ہے اب اگر میں اس سے انکار بھی کر دوں تو کیا ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے اور خدا کو اکثر اوقات کچھ بھی منظور نہیں ہوتا۔ یوں ہونے کو تو کیا ہے جو اس شہر میں نہیں ہوتا۔ سنیما دیکھنے کے بعد آپ لکشمی چوک سے دو آنے سواری ٹانگہ میں تشریف رکھئے چار سے زائد سواریاں نظر آئیں گی۔ پانچ سواریوں والے ٹانگے ہسپتال روڈ پر دن دہاڑے ٹریفک کے خلاف چلتے رہتے ہیں اور جب پکڑے جاتے ہیں تو چپکے سے کچھ اور ہی چیز چل جاتی ہے۔ اور معاملہ رفع دفع ہو جاتا ہے۔ چلنے والی چیزوں میں ایک نام اس چیز کا بھی ہے جو کوچوان اور ٹریفک کے سپاہی میں چل جاتی ہے لیکن پیارے پڑھنے والو!

چلتی کا نام کے عنوان سے میں ابھی تک وہ مضمون نہیں لکھ سکا۔ جس میں مسعود صاحب کا ذکر کرنا تھا۔ ایک شام مسعود صاحب

اپنے بنگلہ پر پہنچے تو اُن کے پیٹ میں درد اُٹھا۔ درد بھی ایسا کہ وہ تڑپ اٹھے۔ اگلے روز میری ان سے ہسپتال میں ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا "آپ کو اتنی جلدی ہسپتال میں داخلہ کیسے مل گیا۔ میرا افسانہ نگار دوست تو ایک زمانہ سے دق کے جراثیم لئے پھر رہا ہے لیکن وہ داخل نہیں ہو سکا۔"

مسعود صاحب نے سرخ کمبل اوڑھتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر ارشد نے داخل کرا دیا تھا۔"

افسانہ نگار ڈاکٹر ارشد کو نہیں جانتا اور ڈاکٹر ارشد کسی افسانہ نگار کو جاننا بھی نہیں چاہتا۔ کیوں کہ افسانہ نگاروں کے پاس اتنے کشادہ بنگلے نہیں جن کے پورچ میں ایمبولنس کار کھڑی ہو سکے۔ میرا افسانہ نگار دوست تو حویلی کابلی مل میں ایک چھوٹی اینٹوں کے مکان میں رہتا ہے جہاں سے ہوا اور روشنی کا گذر بھی مشکل ہی سے ہوتا ہے ڈاکٹر ارشد کو ایسے لوگ سخت ناپسند ہیں جو پرانی پتلون اور پھٹے ہوئے جوتے پہنتے ہیں اور افسانے لکھتے ہیں۔ اس نے جاوید سے کہا تھا کہ تم اس بھیچر آدمی کے ساتھ کیوں گھومتے ہو جو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار پر ایک روزنامہ میں سب ایڈیٹر کا کام کرتا ہے اور زمین پر سوتا

ہے تمہیں اپنے وقار کا خیال رکھنا چاہیئے۔ لیکن جاوید نے اپنے وقار کا خیال نہیں رکھا اور وہ بدستور میرے ساتھ گھومتا رہا۔ ڈاکٹر ارشد جن دنوں پڑھتا تھا تو میرے ساتھ فلاش کھیلا کرتا تھا، اور اسے میرا نام بھی معلوم تھا۔ پھر جب وہ ڈاکٹر بن گیا تو اس نے میرے ساتھ فلاش کھیلنی بند کردی۔ اس کے بعد وہ ڈاکٹری چھوڑ کر سی۔ایس پی ہو گیا۔ بس اسی روز سے وہ میرا نام بھول گیا ہے۔ اب اگر کبھی راستہ میں ملاقات ہو جاتی ہے تو وہ جاوید ہی سے باتیں کرتا رہتا ہے۔ اور میری طرف دیکھنا ضروری نہیں سمجھتا۔ کیوں کہ جاوید نہر کے کنارے ایک سُرخ دروازوں والے بنگلہ میں رہتا ہے، اور اس کے بھائی جان بھی سی، ایس پی ہیں۔ میرا کوئی بھی بھائی جان نہیں۔ میں خود ہی بھائی جان ہوں اور میرے چھوٹے بھائی نے چیئرمین کے نام سفارشی خط کے ساتھ ملازمت کی درخواست دے رکھی ہے اور سردی سے بچنے کے لئے اس کے پاس کوٹ بھی نہیں ہے۔ درخواست کے ساتھ سفارشی خط لگاتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ بھائی جان چلتی کا نام گاڑی ہے۔

یہ بات سن کر میں نے پھر سوچا کہ مجھے ایک مضمون لکھنا چاہیئے

جس میں چلتی کا حقیقی نام دریافت کیا جائے اور اس سلسلہ میں لکھا جائے کہ وطنِ عزیز کی گاڑیوں کے نیچے آکر آئے دن کئی سر جسموں سے الگ ہو جاتے ہیں۔ اخباروں میں خبر چھپتی ہے۔ اور محکمہ شماریات کے کارندے خودکشی کی وارداتوں کے اعداد و شمار جمع کرتے رہتے ہیں۔ تحقیقاتی کمیٹیوں کے اراکین ان حادثوں کے اسباب بھی معلوم کر لیتے ہیں پھر بھی سر کٹتے رہتے ہیں۔ ٹرین چلتی رہتی ہے اور لوگ چلتی کو گاڑی ہی کہے جاتے ہیں۔

اور پیارے قارئین:-

سچی بات تو یہ ہے کہ میں مجوزہ فیچر اس لئے نہیں لکھ سکا، کہ مجھے چلنے والی چیزوں کے بارے میں یہ بھی معلوم نہیں کہ ہمارے ہاں واقفیت چلتی ہے۔ خوبصورت سفارشی چلتے ہیں یا میلے کچیلے نوٹ چلتے ہیں۔ اس لئے میں حتمی طور پر نہیں بتا سکتا کہ چلتی کا نام سفارش ہے، رشوت ہے یا گاڑی ہے۔

مگر چلتی کے ان گنت ناموں میں سے ایک نام سفارش ضرور ہے۔ اس کی وجہ جاننے سے پہلے آپ عالی جناب کو جان لیجئے۔ عالی جناب کسولی میں پولیس افسر تھے، وہاں انہوں نے

کوٹھی بنانے کے لئے پانچ سو روپے میں زمین خریدی تھی کہ پاکستان بن گیا۔ یہاں آکر زمین کے کلیم کی مالیت باون ہزار روپے منظور ہوئی ہے۔ اور ابھی کرایہ کی رقم کے لئے انہوں نے اپیل کر رکھی ہے۔ ایسا اس لئے ہوا کہ انہوں نے کلیم افسر کے بیٹے کو وکیل کیا تھا، چنانچہ چلتی کا ایک نام وکالت بھی ہو سکتا ہے۔

میں نے سوچا تھا کہ مذکورہ بالا عنوان سے میں آپ کو چلتی کا ایک نیا نام بھی بتاؤں گا۔ مضمون تو میں نہیں لکھ سکا۔ البتہ وہ نام ضرور لکھوں گا۔ ہاں تو وہ نام ہے قلم۔ جج کا قلم چلتا ہے، یا پنجاب کی اردو میں قلم چلتی ہے تو ملزم جیل خانہ میں بند ہو جاتا ہے، ایڈیٹر کی قلم چلتی ہے۔ تو مضمون چھپ جاتا ہے اور مضمون نگار کے قرض خواہ مطمئن ہو جاتے ہیں۔ مضمون کی اشاعت کے بعد معاوضہ کی ادائیگی کا مسئلہ اکاونٹنٹ کی قلم چلنے سے حل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مضمون نگار کی قلم چلتی ہے تو اس کی زد میں معاہدہ بغداد سے وان لیونٹ تک سبھی کچھ آجاتا ہے، اور میں چونکہ ایک مضمون نگار ہوں اس لئے آپ کے سامنے یہ اعتراف کر لینے میں بہتری سمجھتا ہوں کہ بے حد کوشش کرنے پر بھی میں آج تک وہ مضمون نہیں

لکھ سکا۔ جس کا عنوان چلتی کا نام ہے۔ کیوں کہ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ چلتی کو چلتی ہی کہا جائے۔ چلنے اور چلانے کا یہ سلسلہ بہت طویل ہے، اور اس سلسلہ کی بھول بھلیاں ہیں بیکسی سے مجبور ہو کر آسمانوں کی طرف دیکھنے والی آنکھیں ہیں۔ ٹھنڈے پانی کے کناروں پر بیٹھے ہوئے پیاسے لوگوں کے خشک ہونٹ ہیں، ان ہونٹوں اور آنکھوں پر صبح کے وقت چٹکنے والی کلیوں کا نکھار نہیں۔ بلکہ لوہاری دروازہ کے باہر سرسوں کا ساگ بیچنے والی دیہاتی لڑکیوں کے نوحے ہیں۔ لنڈے کے پرانے سوٹوں میں ملبوس نوجوانوں کے دلوں کی اُداسی ہے۔ چہروں کی تھکن ہے، اور تنگ و تاریک گلیوں میں اڑنے والی دھول ہے۔ گرد و غبار کی دبیز چادر کے پیچھے زندگی کی نوخیز حسینہ ان لوگوں کو اپنی طرف بلا رہی ہے جو کارپوریشن کے لاہور سے دور لاٹ صاحب کے لاہور میں رہتے ہیں۔ جہاں بنگلوں کے ریشمیں پردوں کے پیچھے رنگوں اور کرنوں کا ایک جہان آباد ہے۔

لاٹ صاحب کے لاہور میں رہنے والی اللہ میاں کی ٹیکنی کلر مخلوق جب رنگ برنگی کرنوں سے گزرتی ہے، تو یوں معلوم ہوتا

ہے جیسے یہ لوگ توس دقزح کی گزرگاہ کے مسافر ہیں۔ لیکن مجھے کہنے دیجئے کہ نومبر کی سرد شاموں میں مال روڈ کے کشادہ سینہ پر تیرتی ہوئی گاڑیاں۔ ریگل کے چوک پر بسنتی روشنی میں ڈوبا ہوا ٹریفک کا سپاہی اور اس سے آگے ـــ جو کچھ بھی ہے، ایک خواب ہے حقیقتوں کے صحرا اب ان سے زیادہ دُور نہیں رہے۔

مال روڈ اور لوہاری دروازہ کا درمیانی فاصلہ بڑھتے بڑھتے اتنا بڑھ چکا ہے۔ کہ مزید بڑھنے کی گنجائش نہیں رہی۔ اور قربتیں ایک بار پھر جنم لینے پر مجبور ہو گئی ہیں۔ جب یہ فاصلے ختم ہو جائیں گے۔ یہ فرق مٹ جائے گا، تو مجھے یقین ہے کہ میں "چلتی کا نام" کے عنوان سے جو مضمون لکھنا چاہتا ہوں ضرور لکھ ڈالوں گا۔

○

ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور

۸ ر دسمبر ۶۵۷

لیڈر کے نام

اے عوام کے ہمدرد رہنما ــــ! میری پسلی میں
ایک زمانہ سے درد اُٹھ رہا ہے لیکن دوائیں آجکل
بلیک میں ملتی ہیں اور بلیک میں دوائیں وہی
لوگ خرید سکتے ہیں جو بلیک اینڈ وائٹ کے سگریٹ
پیتے ہیں۔

پیارے لیڈر!

مجھے اس وقت تم پر بہت پیار آ رہا ہے کیونکہ آج میں نے موچی دروازہ کے باغ میں تمہاری تقریر سنی تھی اس تقریر کے الفاظ اب تک میرے ذہن میں گونج رہے ہیں اور میں سوچ رہا ہوں کہ تمہارے دل میں عوام کے لئے کتنا درد ہے لیکن اسے کیا کہیئے کہ ع

درد منت کشِ دوا نہ ہوا

اے عوام کے ہمدرد رہنما میری پسلی میں ایک زمانہ سے درد اُٹھ رہا ہے لیکن دوائیں آج کل بلیک مارکیٹ میں ملتی ہیں اور بلیک میں دوا صرف وہی لوگ خرید سکتے ہیں جو بلیک اینڈ وائٹ

کے سگریٹ پیتے ہیں۔ میں نے جب تمہیں پہلے پہل دیکھا۔ تو تمہاری باتیں میرے دل میں گھر کر گئیں اور میں بے گھر ہو گیا تھا، اسی روز سے میں بحالیات کے چکر میں ہوں تم نے کہا تھا عوام کی خدمت کے لئے دردِ دل کی ضرورت ہے میرا تجربہ یہ ہے کہ درد دل پیدا کرنے کے لئے بڑی سر دردی مول لینا پڑتی ہے اور ع

دردِ سر کے واسطے صندل لگانا ہے مفید

صندل لگانے کے لئے پیسوں کی ضرورت پڑتی ہے اور پیسہ صرف تمہارے بنک کا راستہ جانتا ہے۔ تمہارا بنک "ان کارپوریٹڈ ان امریکہ" ہے۔ امریکہ یہاں سے بہت دور سہی لیکن راکٹ اور سپوتنک کے اس دور میں وقت اور فاصلہ بے معنی بنتے جا رہے ہیں جس تیزی سے تم اپنا اصول بدلتے ہو، اسی سرعت سے سفر بھی کرتے ہو۔ ابھی یہاں ابھی واشنگٹن۔ واشنگٹن نہ ہوا۔ موچی دروازہ کا باغ ہو گیا جہاں جو چاہے چلا جائے آج موچی دروازہ کے جلسہ میں مجھے برسوں کے بعد تمہارا دیدار نصیب ہوا ہیں تمہارا دیرینہ خادم ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ تم مجھے بھول گئے ہو گے کیونکہ بھول جانا بڑے آدمیوں کی عادت ہے۔

عادت کے ذکر سے مجھے تمہاری تقریر کا وہ حصہ یاد نہیں آیا۔ جب
تم نے عوام کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی عادتوں کا جائزہ لیں اور روزمرّہ
کے تعلقات میں وعدوں کا احترام کریں۔ تم نے یہ بھی کہا تھا کہ بھڑکیلے
لباس پہننا اچھی عادت نہیں کیوں کہ اس طرح غریب ہموطنوں میں
احساسِ محرومی پیدا ہوتا ہے۔ تم نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ محرومی کا
احساس نہیں پیدا ہونا چاہیے خواہ عوام تمام بنیادی ضرورتوں سے
محروم ہو جائیں۔ اتنی کارآمد نصیحتیں کرنے کے بعد تم نے ملک و ملّت
کے نام پر چندہ کی اپیل بھی کی تھی جو منظور کر لی گئی۔ ایک میں ہوں جس
نے کلیمز کمشنر کے دفتر میں اپیل دائر کر رکھی ہے اور سال بھر سے
اس کا کوئی جواب نہیں ملا۔ چندہ کے نام پر ہزاروں حاضرینِ جلسہ کی
طرح میں نے بھی اپنی جیب ٹٹول کر دیکھی جس میں بمشکل چند آنے رہ
گئے تھے اور مجھے سارا دن گذارنا تھا۔ دن تو سبھی گزر جاتے ہیں
یوں بھی ہوتا ہے کہ میرے جیسا کوئی شخص زندگی کے دن گزارتے
گزارتے خود ہی گذر جاتا ہے۔ ہم گئے گزرے لوگوں کا تو ذکر ہی
کیا مر جائیں تو اخبار میں خبر تک نہیں چھپتی تمہارے جیسا کوئی محبوب
رہنما اگر خدا نہ کرے اللہ کو پیارا ہو جائے تو مہینوں اس کا ذکر رہتا ہے

تصویریں چھپتی ہیں۔ تعزیتی جلسے ہوتے ہیں دراصل تم لیڈر لوگ جلسہ کے بغیر نہیں رہ سکتے جلسہ ہو چاہے فنا طلیں گاڑنے والے کارکنوں کے فاقہ کش بیوی بچوں کا جلوس ہی نکل جائے تمہارے لاؤڈ سپیکر کو چیخنا ہے چلّانا ہے اس شور میں عوام کی آہ و پکار گم ہو جاتی ہے۔ میں بھی چونکہ یکے از عوام ہی ہوں اس لئے میں نے اپنی پکار تم تک پہنچانے کے لئے تمہارے نام خط لکھنے کا ارادہ کیا ہے اس خط کو سپرد ڈاک کرنے کے لئے میرے پاس چھ پیسے نہیں یہی وجہ ہے کہ میں یہ خط اس اخبار کو بھیج رہا ہوں جیسے تم بھری محفلوں میں گالیاں دیتے ہو اور تنہائی میں اس کا ایک ایک لفظ پڑھتے ہو۔ اُمید ہے کہ میری اس صاف گوئی سے خفا نہیں ہو گے اور اگر تم سچ مچ بگڑ گئے تو میں سمجھوں گا۔ ع

"اس لئے روٹھ گئے ہیں کہ منا لے کوئی"

مجھے تم کو منانے میں کیا تامل ہو سکتا ہے۔ تم روٹھ گئے ہو تو میرا کیا ہو گا تم میرے رہنما ہو اور میں تمہارے پیچھے چلنے والا ایک غریب پاکستانی۔ یوں سمجھ لو بھیڑوں کے ریوڑ میں تمہاری مثال اس اونٹ کی سی ہے جس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں کہ کس کروٹ بیٹھے گا

میں کروڑوں بھیڑ بکریوں میں سے ایک بے زبان بھیڑ ہوں اور میری وصیت یہ ہے کہ اگر بقر عید پر میری قربانی ہوگئی تو میری کھال کو تمہارے کارخانے میں بھیج دیا جائے یا تمہاری جماعت کے خیراتی فنڈ میں جمع کرا دیا جائے۔ بقر عید کے موقع پر قربانی کی کھالیں حاصل کرنے کے لئے جو اپیلیں کی جاتی ہیں ان میں تم ہمیشہ پیش پیش رہتے ہو ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ تم نے کھالیں صاف کرنے کا کارخانہ بھی قائم کیا ہوا ہے تاکہ ملکی صنعت کو فروغ حاصل ہو نیز غریب عوام کو روزگار بھی ملے۔ تمہارا خیال ہے کہ کھالیں اتارنے کا مروّجہ طریقہ بہت فرسودہ ہو چکا ہے اسی لئے تم نے کھالیں اتارنے کے غیر ملکی ماہرین کو اپنے کارخانے میں بلایا ہے اس فن میں تمہیں کتنی مہارت حاصل ہے۔ میں یہ موضوع نہیں چھیڑوں گا کیونکہ تم شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہو اور میں نے یہ مصرع ہزاروں بار سنا ہے۔ کہ ع

نازک مزاجِ شاہاں تابِ سخن ندارد

تمہارا مزاج بہت نازک ہے اور میری حالت بہت نازک ہے پھر بھی مجھ پر تمہاری تقریر کا یہ اثر ہوا ہے کہ میں نے بھڑکیلے لباس کا بائیکاٹ کر دیا ہے۔ تاکہ کہیں تم بھڑک نہ اٹھو کہ اس بھیڑ آدمی کو شارک

سکن پہننے کا کیا حق ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے بھڑکیلا لباس میسر ہی نہیں۔ اب رہ گیا تمہارا یہ مشورہ کہ ہم اپنے وعدوں کا احترام کریں تو عرض ہے کہ وعدوں کا احترام تو رہا ایک طرف ہمیں کوئی وعدہ معاف گواہ بھی نہیں بنانا یہ سعادت صرف تمہارے وعدوں ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ جن پر ہم ہر بار اعتبار کر لیتے ہیں ممکن ہے تمہارے قول کے مطابق عوام کا حافظہ کمزور ہو لیکن مجھے تمہارے وعدوں کے ساتھ یہ بھی یاد ہے کہ وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا۔

وفا کا نام کچھ عوام ہی کی زبان پر چڑھا ہے۔ تم جس شہر میں رہتے ہو۔ وہاں غالباً یہ سکہ نہیں چلتا۔ یوں تو ہم ایک ہی شہر میں رہتے ہیں۔ لیکن ہمارے درمیان بہت فرق ہے۔ جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے تم نے شارک سکن کی شیروانی پہن رکھی تھی۔ شام کو تم سوٹ میں ملبوس تھے۔ شیروانی سے سوٹ تک کا طویل فاصلہ تم کتنی جلد طے کر لیتے ہو اور ہم ہیں کہ گیارہ برس سے بجالیات کے دفتر کا راستہ بھی نہیں طے کر پائے۔

الیکشن کے دنوں میں تم نے مجھے مکان دلانے کا وعدہ کیا تھا لیکن الیکشن کے بعد تمہیں کچھ یاد نہیں رہا اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ تم

ہار گئے تھے اب میں نے سنا ہے کہ الیکشن اس سال پھر ہونے والا ہے اگر سنی سنائی باتوں پر یقین کر لینا دانش مندی ہے۔ تو میری طرح تمہیں بھی تسلیم کر لینا چاہیئے کہ الیکشن ضرور ہوں گے میری دعا ہے کہ خدا تمہیں اب کی بار کامیاب کرا دے، اور تم بحالیات کے وزیر بن جاؤ تاکہ تمہاری طبیعت بحال ہو جائے اور شاید ہماری بدحالی بھی۔

میری کہانی جو عنوان کی تلاش میں راستہ بھول گئی ہے بہت طویل ہے۔ اور طویل باتوں سے وقت ضائع ہوتا ہے۔ وقت ایک تلوار ہے جو فی الحال تمہارے ہاتھوں میں ہے اس تلوار نے کتنے سر جسموں سے الگ کر دیئے ہیں اس کا تمہیں احساس نہیں ہو سکتا کیونکہ احساس ان دنوں صرف کمزور لوگوں کی میراث بن کر رہ گیا ہے۔ تم کمزور ہرگز نہیں ہو تم نے اپنے زورِ بازو سے اتنا بلند مقام حاصل کیا ہے اور میں آج تک مقاماتِ آہ و فغاں سے گزر رہا ہوں اب تم مجھے یہ مت سناؤ کہ ع

مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

جن دنوں تمہاری پارٹی برسرِ اقتدار آگئی تھی تو تم برسرِ پیکار نظر

آنے لگے تھے تم نے ہفتہ بھر میں وفاقی دارالحکومت کے کئی دورے کر ڈالے اور مجھے درد کے دورے پڑتے رہے آخری بار جب تم ہوائی اڈے پر اُترے تو تمہاری جیب میں گھڑی کے پرزوں کا لائسنس تھا وہ لائسنس تمہارے مہربان سکرٹری نے ایک دوافروش کے ہاتھ دوگنی قیمت پر فروخت کر دیا اور سفر خرچ اس کے علاوہ وصول کر لیا۔ دوا فروش نے گھڑی کے تاجر سے کہا کہ گھڑی کے بارے میں ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے کہ یہ وقت دکھانے کا آلہ ہے تم گھڑی کے پرزوں سے واقف ہو یہ تمہارا خاندانی کام ہے اگر لائسنس نہیں ملا تو ہم سے لے لو اس طرح دوا فروش نے اپنا منافع لے کر حق بحقدار رسید کر دیا تھا۔ آخری بار دس ہزار کا لائسنس پچیس ہزار میں فروخت ہوا اور جب میں وقت کی قدر کے اصول سے متاثر ہو کر اپنی پرانی گھڑی میں نیا پرزہ ڈلوانے گیا تو قیمت نئی گھڑی سے بھی زیادہ تھی۔ میری جیب میں امانت کی رقم تھی اس لئے میں نے سوچا کہیں گھڑی میں گھڑیال ہی نہ ہو جائے چنانچہ میں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔

پیارے لیڈر! اب رات گہری ہو چکی ہے اور میرے آس پاس

سب لوگ گہری نیند سو رہے ہیں تم ٹھیک ہی کہتے ہو کہ عوام سو رہے ہیں۔ اس خاموش رات میں تم اپنی معطر خواب گاہ کے دروازے بند کر کے آرام کر رہے ہو گے۔ میرے مقدر کا آرام بھی تم ہی کو مل گیا ہے اس لئے میں اس وقت تک اپنے بستر پر اوندھا لیٹا ہوا لکھ رہا ہوں یہ بستر زمین پر بچھا ہوا ہے میں تمہاری زمینوں کا ذکر چھیڑ کر حاسد نہیں کہلانا چاہتا۔ حاسد کہتے ہیں تمہارے پاس ایک ہزار مربعہ زمین ہے۔ یہ اللہ کی دین ہے کہ تمہارے پاس ہزار مربعے ہیں اور میرے متعلقین کے پاس روٹی کھانے کے لئے چٹنی بھی نہیں۔

میں ہوں یکے از عوام

ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور

۱۵؍جون ۵۸ء

چوہے کی وصیّت

اے نیک چلن بلّی: میں نے سنا ہے۔ کہ تم آٹھ سو ننانوے ۸۹۹ چوہے کھا چکی ہو اور اب آخری چوہا کھانے کے بعد اس سال حج کو جا رہی ہو

اے نیک چلن بلّی ـــــ

اگرچہ تمہارا چال چلن ایک مدت تک مشتبہ رہا ہے۔ پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ تمہیں نیک چلن کہا جائے کیونکہ میں نے سنا ہے کہ تم آٹھ سو ننانوے ۸۹۹ چوہوں کو ہضم کر چکی ہو اور اب آخری چوہا کھانے کے بعد حج کو جانے کا ارادہ رکھتی ہو۔

جس وقت مجھے یہ اطلاع ملی میں ہال روڈ پر کھڑا تھا اور تم نے مال روڈ کے کسی خوبصورت ریستوران میں بیٹھے ہوئے یہ انکشاف کیا تھا کہ آخری بار تم مجھے کھانا چاہتی ہو۔ یہی بات تھی جو اس وصیت نامہ کا باعث بنی ہے میں سمجھتا ہوں تمہارے تالو آنے سے بہتر ہے کہ میں خود کشی کر لوں۔ اسی لئے میں نے مال روڈ پر

جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے - یہاں مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ان دنوں میرے حالات بہت خراب ہیں - میں حال مست ہوں اس لئے ہال روڈ سے آگے نہیں جاتا اور تم مال مست ہونے کی مناسبت سے اکثر مال روڈ پر پائی جاتی ہو - دراصل یہ زمانہ ہی مالداروں کا ہے جس کے پلے مال نہ ہو اسے تو کوئی مال گاڑی کے نیچے آ کر خودکشی بھی نہیں کرنے دیتا - اتنا تو مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ آخری چوہے کے انتخاب میں تمہاری نظرِ کرم مجھ پر پڑی ہے - نظرِ کرم کی بات کرتے ہوئے مجھے کرم دین جاگیردار کا خیال آ رہا ہے جس نے تمہارے ایسی بہت سی مہربان بلیاں پال رکھی ہیں - کرم دین ہم چوہوں کے لئے ستم دین کیرل بن گیا ہے یہ جاننے سے زیادہ ضروری وہ باتیں ہیں جو ایک زمانہ سے میرے سینے میں پرورش پا رہی ہیں اور میرے چھوٹے چھوٹے بچوں کی پرورش کچھ اس انداز سے ہو رہی ہے کہ وہ سارا دن گلی میں گلی ڈنڈا کھیلا کرتے ہیں اور جب گھر پہنچتے ہیں تو آتے ہی سالن کی خالی پتیلی کو ندیدوں کی طرح چاٹنے لگتے ہیں - اس وقت ان کے ننھے ننھے ہاتھوں میں روٹی کے سوکھے ٹکڑے ہوتے ہیں اور ننگے

جسموں پر گندی نالیوں کی غلاظت جمی ہوتی ہے۔ تمہیں ایسے ناتوان بچوں کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں شاید کوئی داستان نظر نہ آئے۔ کیونکہ تم بہت نفیس طبیعت رکھتی ہو۔ تمہارے ریشمی کپڑوں سے "شنیل نمبر ۵" کی خوشبو اٹھتی ہے۔ اور میرے بچوں کے لباس سے تعفن اٹھتا ہے۔

ابھی پچھلے دنوں جب تم نے ایک جلسۂ عام میں فاقہ کش جوہوں کے لئے امریکی گھی تقسیم کیا تھا۔ تو اخبار کے فوٹو گرافر نے دھڑا دھڑ تمہاری تصویریں اتار لی تھیں۔ پھر وہ تصویروں کے پرنٹ لے کر تمہارے بنگلہ پر گیا اور جو تصویریں تمہیں سب سے زیادہ پسند تھیں اگلے روز وہی اخبار میں شائع ہوئی تھیں۔ اس تصویر میں تم بہت رحمدل اور غریب پرور دکھائی دیتی تھیں۔ مجھے تمہاری رحمدلی اور غریب پروری کے بارے میں کچھ نہیں کہنا ہے۔ میں تو صرف یہ گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ اب آدھی رات گذر چکی ہے۔ اس وقت تم اپنی معطر خواب گاہ میں گداز بستر پر لیٹی ہوئی میٹھے خواب دیکھ رہی ہوگی۔ لیکن یاد رکھو کہ رات ضرور گزر جائے گی۔ سویرا ہونے والا ہے۔ اور خواب بہرحال خواب ہی ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ

یہ سہانا خواب ٹوٹ جائے اور تم حقائق کی سنگین چٹانوں سے ٹکرا جاؤ۔ میں صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ تمہیں بہروپ بھرنے میں جو کمال حاصل ہے وہی تمہارے زوال کا باعث ہوگا۔ نوسو چوہے کھانے کی روایتی تعداد پوری کرنے کے دوران میں تم نے جتنے بھیس بدلے ہیں وہ میں اچھی طرح جانتا ہوں مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آج شام تم نے اپنی برادری کی چند معزز بلیوں کے درمیان بیٹھے ہوئے کتنے درد بھرے لہجہ میں کیا تھا کہ

"زندگی کا کیا بھروسہ ہے۔ یہ میرا آخیر وقت ہے
سوچتی ہوں دنیا کے دھندے چھوڑ کر حج کے لئے
چلی جاؤں۔ اور باقی زندگی اللہ کی یاد میں بسر کر دوں"۔

یہ تم نے ٹھیک کہا ہے زندگی کا واقعی کوئی بھروسہ نہیں۔ تم حج کے لئے روانہ ہو جاؤ تو یہ ہم چوہوں پر احسان ہوگا۔ رہ گئی باقی زندگی اللہ کی یاد میں بسر کرنے کی بات تو اس تکلیف کی بھلا کیا ضرورت ہے اللہ کو تو وہ یاد کرتا ہے۔ جسے سب نے بھلا رکھا ہو۔ تم پر تو اس کی مہربانیوں اور عنایتوں کے دروازے کبھی بند نہیں ہوئے تم اگر اسے یاد نہ بھی کرو تو کیا فرق پڑتا ہے۔ البتہ اگر تم آخری چوہا

کھائے بغیر چلی گئیں تو بڑا فرق پڑ جائے گا۔ یہ غلطی ہرگز نہ کرنا۔ میں تو شائد اس سعادت سے محروم ہی رہوں۔ البتہ میں یہ کرسکتا ہوں کہ بڑی سعادت مندی سے تمہیں سفرِ حج کے بارے میں چند باتیں بتا دوں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی معلوماتِ حج کمپنی کے چکر میں نہ آجانا کیوں کہ یہ لوگ کبھی کبھی زائرین کو راستہ ہی میں چھوڑ جاتے ہیں۔ اور ان کے پاس واپسی کا کرایہ بھی نہیں چھوڑتے، اور پچھلے دنوں تو حاجیوں کے قبضہ سے بہت سا ناجائز سونا بھی پکڑا گیا تھا۔ تم سونا لانے کی کوشش نہ کرنا سونے سے کیا ہوتا ہے اب تو جاگنے کی کوشش کرو اور کان کھول کر سنو:۔

یہ بات سناتے ہوئے میرا دل ڈوبنے لگتا ہے، کہ
کبھی کبھی حاجیوں کے جہاز ڈوب بھی جایا کرتے ہیں
تم تو ماشاء اللہ نہایت عاقل و بالغ بلّی ہو تمہیں
ان باتوں پر دھیان دینے کی کیا ضرورت ہے۔
البتہ مجھے یہ یاد دلانے کی ضرورت پھر محسوس
ہو رہی ہے کہ تم زندگی بھر نت نئے روپ بھانتی

بھی ہو۔

○

مجھے اچھی طرح یاد ہے برسوں پہلے تم نے انارکلی میں کپڑے کی ایک دوکان کھول رکھی تھی۔ ایک روز تم نے اپنی ہم پیشہ بلیوں کو بڑے فخر سے بتایا تھا کہ میں نے ایک بی۔اے پاس چوہے کو ملازم رکھا ہے۔ حالانکہ خود تم نے پرائمری کا امتحان بھی پاس نہیں کیا تھا۔ اس چوہے کی مریل بیوی ہر سال ایک نحیف و نزار بچے کو جنم دیتی تھی۔ اسی لئے وہ مبلغ تیس روپے ماہوار کے گراں قدر مشاہرہ پر تمہارے ہاں پارٹ ٹائم ملازم ہو گیا تھا۔ اور دوکان کا حساب کرنے کے بعد تمہارے عاشقانہ خطوط بھی ٹائپ کیا کرتا تھا۔ گھر کے لئے سبزی لانے میں بھی اعتراض نہیں کرتا تھا۔ ایک روز وہ اپنی بیوی کے لئے دوا لینے ہسپتال گیا تھا۔ وہاں دیر ہو گئی۔ ڈاکٹر تک پہنچنے کے لئے لاکھ جتن کئے لیکن اس کی باری بہت دیر سے آئی اور جب وہ تمہاری دکان پر آیا تو تم نے دیر سے آنے کے جرم میں اسے ہضم کر لیا۔ میں کہتا ہوں تمہارا ہاضمہ بہت اچھا ہے، ایک

میں ہوں جیسے کچھ ہضم ہی نہیں ہوتا اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے ہضم کرنے کے لئے کچھ ملتا ہی نہیں۔

میرے ساتھ تمہارا تعارف پچھلے دنوں ہوا تھا تم نے اخبار میں اشتہار دیا کہ "ہمیں ایک ایسے چوہے کی ضرورت ہے۔ جو ہماری زیرِ تکمیل فلم کی کہانی کو بہتر بنانے کے علاوہ ہماری مرضی کے مکالمے لکھ سکتا ہو تنخواہ حسبِ لیاقت دی جائے گی"۔میں نے درخواست بھیجی اور تم نے مجھے ملازم رکھ لیا۔ اسی ملازمت کے دوران میں مجھے تمہارے گذشتہ حالات کا علم ہوا تھا۔ میں نے مہینہ بھر مکالمے لکھنے کے بعد تم سے تنخواہ کی بات چلائی تو تم نے کہہ دیا کہ

"میں نے فلم بنانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ کیونکہ یہ کام صرف بھانڈوں کے کرنے کا ہے۔ ویسے تنخواہ حسبِ لیاقت دی جانی تھی لیکن تم بالکل نالائق ثابت ہوئے ہو لہٰذا ــــــ!"

میں چپ چاپ تمہارے دفتر کی سیڑھیاں اُتر آیا۔ اس روز سے آج تک تم دو فلمیں بنا چکی ہو، اور تمہیں بدستور میری تلاش ہے

کیونکہ تم آخری چوہا کھانے کے بعد فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے جانا چاہتی ہو۔ مجھے تم کو مبارکباد دینا ہے کہ الحمدللہ تم نے تقریباً نو سو چوہے ہضم کر لیے ہیں وہ جو ایک باقی رہ گیا ہے وہ میں ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مجھ تک پہنچنے کے لئے تمہیں جس راستہ سے گزر کر آنا ہوگا۔ وہاں اور بہت سے چوہے ملیں گے تمہاری مہربانی ہوگی اگر تم انہی میں سے کسی ایک کو دبوچ لو۔ اور مہربان علی ادارہ حج والے کی معرفت اس ملک سے تشریف لے جاؤ۔ لیکن آخری چوہے پر ذرا سوچ سمجھ کر ہاتھ ڈالنا۔ کیونکہ چوہے آج کل بہت چالاک ہو گئے ہیں۔ اور انہوں نے تمہارے خلاف متحدہ محاذ بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور راستوں میں نظر نہ آنے والے جال بچھا رکھے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو تم کسی چوہے پر جھپٹو اور جال میں پھنس جاؤ۔ اور خدا نہ کرے کہیں تمہیں حج کو جانے سے پہلے اللہ میاں کے ہاں جانا پڑ جائے۔

میں ہوں ایک چوہا

ہفت روزہ لیل و نہار لاہور — حال مقیم لوہاری منڈی

۵ جنوری ۵۸ء — لاہور

گلیاں اور بازار

فلٹی بوس دروازوں کے اندر کارپوریشن کا لاہور ہے اس سے آگے جو لاہور شروع ہوتا ہے ۔ اسے لاٹ صاحب کا لاہور کہتے ہیں جہاں رہنے کے لئے بیوک بنگلہ بینک بیلنس اور بیگم کی ضرورت پیش آتی ہے۔

لاہور کی گلیاں بہت پُر اسرار ہیں۔ اور بازار بہت وسیع ہیں
میں نے سوچا، ان گلیوں کے تاریک گوشوں میں زندگی گزارنے والے
قومی کارکنوں کے چہروں کو پڑھوں اور لکھوں۔

ان کارکنوں نے قومی تحریکوں کے آغاز سے انتہا
تک حالات کے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں، اور ملکی
آزادی کے پودوں کو خون سے سینچا ہے اور

قوم اور ملک کا مقدر بنانے والے لوگ اس لاہور میں گھٹی
گھٹی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ لاہور کی گلیوں اور بازاروں کے
موڑوں پر ایسے لوگ بھی دکھائی دیتے ہیں جو بظاہر اپنی بے بسی
اور وقت کی بے رحمی کا شکار ہوتے ہیں مگر انھوں نے وقت کی

ہر مصیبت کو اس لئے سینے سے لگایا کہ وہ ملک کو خوشحال اور آزاد دیکھنے کی آرزو میں اپنے خوبصورت ایام کو جیل کی تنگ و تاریک فضا کے سپرد کر آئے تھے ——— اس سے کچھ دور جہاں روشنیاں ہوتی ہیں۔ ان روشنیوں کے وسیع و عریض ماحول کو دیکھتے دیکھتے جب نگاہ اپنے سائے پھیلا دیتی ہے۔ اس وقت احساس ہوتا ہے کہ زندگی کی ان گلیوں اور بازاروں میں دور تک واقعات کی کڑیاں بکھر گئی ہیں اور ان کڑیوں کو ملانے کے لئے لاہور میں گھومنا پڑتا ہے۔

لیکن جیسا کہ لاہور کے نقشے پر پراسرار گلیوں اور وسیع بازاروں کا جال بچھا ہوا ہے اور ہر گلی ایک بازار میں جا نکلتی ہے اس سلسلے میں ایک مشہور سیاسی ورکر غلام مصطفیٰ انقلاب کا کہنا ہے کہ اس لاہور میں ہر روز پندرہ میل چلتا ہوں اور تمام بازاروں اور گلیوں کی دھول میرے مقدر پر جم چکی ہے

لاہور میں اور بھی ایسے افراد موجود ہیں جنہیں قومی تحریکوں کے ساتھ چلنے کا موقعہ تو نہیں ملا۔ مگر زندگی اور حالات کے چکر میں وہ اب تک چل رہے ہیں۔

اسی لاہور میں ہزاروں کلرک، مزدور اور دوسرے محنتی افراد بھی موجود ہیں۔ جو ایک طویل عرصہ سے لاہور کی سڑکوں کی پیمائش کرتے ہیں۔ اور جب اپنی تنخواہوں اور محنتوں کے معاوضہ سے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر معمولی سائیکل خریدنے کی خواہش کرتے ہیں۔ تو "کالے بازار" میں سے آواز آتی ہے۔

"پورے دو مہینوں کی تنخواہ اور لاؤ۔ اور سوچنا پڑتا ہے۔ اگر سائیکل خرید لیا گیا تو راشن کہاں سے آئے گا"

یہاں سائیکل خریدنے کی خواہش کسی ملک کا بادشاہ بننے کا خواب بن جاتی ہے۔ انارکلی کے سرے پر سائیکل کی بتیاں بیچنے والا سیاسی ورکر غلام مصطفےٰ انقلاب تمام بتیوں کو پھونک مار کر بجھا دیتا ہے اور اپنے اندھیرے کمرے میں خالی پیٹ سو جاتا ہے۔

سائیکل کے ایک دم کالے بازار میں بکنے سے لوگ پیدل چلتے ہیں۔ گلیوں اور بازاروں میں تکان زدہ کلرک اور مزدور نڈھال چہرے لئے پھرتے ہیں ——— اور اس واقعہ سے معاشرہ کے افراد بھوک اور مفلسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد ایک مشہور سڑک کے کنارے واقع بلڈنگ میں سائیکلوں کے پرمٹ دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں کے ہاتھوں سے نکل کر کالے بازار میں اپنی قیمت وصول کرتے ہیں۔ اور مجبور طبقہ پھر پیدل چلتا رہتا ہے۔

میرے ایک جاننے والے نے ایک سال سے درخواست سائیکل کے پرمٹ کے لئے دی ہوئی ہے اور وہ اس پرمٹ کو حاصل کرنے کے لئے سینکڑوں مرتبہ راشننگ کنٹرولر کے دفتر کی کھڑکی کے قریب بیٹھے ہوئے کلرک سے پوچھ چکا ہے کہ "میری درخواست کا کیا بنا ——— ؟" ایک سر ادھر ادھر ہلتا ہے اور درخواست کنندہ پیدل چلتے ہوئے ان گلیوں اور بازاروں میں پیدل چلنے والوں کے ساتھ مل کر سوچنے لگتا ہے

"کاش میری درخواست کو پہیئے لگ سکتے۔"

یہاں پہیوں کا استعمال کچھ برمحل معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ جو لوگ اپنی درخواستوں کو پہیئے لگا کر پرمٹ حاصل کرتے ہیں، ان

کی نئی نویلی سائیکلیں گلیوں اور بازاروں میں سرپٹ دوڑتی ہیں، ——— اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو چند لوگوں کو اتنی جلدی پرمٹ کیوں مل جاتے ہیں ——— اور زیادہ لوگ پرمٹ کی آس لئے کیوں تھک جاتے ہیں ——— ؟

○

بتیاں بیچنے والے سیاسی کارکن کا کہنا ہے، پرمٹ بھی ان لوگوں کو ملتا ہے جو مجھ سے ٹین کی بتیاں خریدنے کی بجائے ڈائنمو لگاتے ہیں۔ اور چند گلیاں اور چند بازار پھر بھی اندھیرے میں رہتے ہیں۔

فلمی چوک

لاہور کے خلاک بوس تاریخی دروازوں کی محرابوں سے گزرتے ہوئے کیسا بلانکا کی قدیم تہذیب اور بغداد کے معبدوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے دروازوں کے اندر کارپوریشن کا شہر آباد ہے اس سے آگے جو لاہور شروع ہوتا ہے اور کوسوں دور نکل جاتا ہے اسے

بنگلوں، کاروں، ہوٹلوں اور بوٹوں کا لاہور ہے اور یہاں رہنے

کے لئے بیوک بنگلہ، بے بی، اور بنک بیلنس کی ضرورت پیش آتی ہے اس سے ذرا چھوٹے طبقہ کا لاہور سینماؤں کا لاہور کہلاتا ہے۔ جو میکلوڈ روڈ کی وجہ سے مشہور ہے۔ میکلوڈ روڈ کے رسوائے عالم چوک کا ایک پہلو دیکھئے وہاں بہت سے ہوٹل ہیں اور ہر ہوٹل فلم زدہ نوجوانوں کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ سٹوڈیو کے قلیوں سے پروڈیوسروں تک فلم کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے اس چوک میں کھڑے ہو کر پان کھاتے ہیں سگریٹ پیتے ہیں اور ان فلموں کی باتیں کرتے ہیں" جو ڈبوں میں سلور جوبلی" منا رہی ہیں۔ اداکار بننے کے شوقین اپنے فارغ اوقات میں کاروبار کرتے ہیں۔ ایک لڑکا برش بنانے کا کام کیا کرتا تھا اور اس کے آس پاس کی فلمی مخلوق اسے "برش کمار" کے نام سے پکارا کرتی تھی۔ اس کارخانہ کے بنے ہوئے برش کپڑوں سے فرشوں تک کی صفائی کے کام آتے تھے لیکن ان سے پروڈیوسر کی جیب صاف کرنے کا کام نہیں لیا جا سکتا تھا۔ اسی وجہ سے کارخانہ دار کا دل صاف نہیں ہوتا ——— اور ایک روز اس نے اپنے "برش کمار" کو ملازمت سے جواب دے دیا۔ جو آج کل لکشمی چوک اور رائل پارک کے درمیانی علاقہ میں گھومتا نظر آتا ہے۔ رائل پارک کا شمار لاہور کے عجائبات میں

ہوتا ہے کیونکہ وہاں ہر چیز عجیب ہے۔ ایکٹر بھرتی کرنے کے مرکز ہیں۔ اخباروں کے دفتر اور امدادی کمیٹیوں کے صدر دفتر بھی ہیں۔ یہ کمیٹیاں صرف ڈائریکٹروں کی امداد کے لئے کھولی جاتی ہیں اور کچھ اس انداز سے چلائی جاتی ہیں کہ چند دنوں میں چلانے والے کے پاس کار کوٹھی اور ریکیش سبھی کچھ جمع ہو جاتا ہے اور زندگی تیزی سے چلنے لگتی ہے۔ اسیطرح کمپنی چالو ہو جاتی ہے۔ رائل پارک کی دوسری چلنے والی چیز راشن کا دفتر ہے جس کے دروازوں پر عورتیں قطار بنا کر جاتی رہتی ہیں اور دروازوں کے اندر پرمٹ چلتے ہیں اور چلتے چلتے عملہ کے منظور نظر لوگوں کے گھروں تک پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن باہر قطار میں کھڑی ہوئی عورتوں تک یہ پرمٹ شاذ و نادر ہی پہنچتے ہیں اور راشن دفتر کے اندر سب کچھ چلتا ہے چلنے چلانے کا سلسلہ تو رائل پارک میں دن رات جاری رہتا ہے۔ البتہ ایک چیز یہاں جم کر بیٹھ گئی ہے۔ اور وہ ہے رائل پارک کے کچے راستوں پر اڑنے والی دھول جو کبھی کبھی امدادی کمیٹیوں والے اپنے ممبروں کی آنکھوں میں جھونکنے کے کام میں لاتے ہیں۔ ہاں تو یہاں کم و بیش ہر عمارت شاندار ہے ان عمارتوں کی شان طبلہ کی تھاپ اور سارنگی کے سُروں سے قائم رکھی

جاتی ہے۔ رقص و نغمہ سے بھرپور فضائیں رائل پارک کی زندگی کو مسرور و شاداں کئے رہتی ہیں - اور کبھی کبھی یہ شادمانی اچانک نوحہ کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہے

شاید دو برس پہلے کی بات ہے لاہور کو ایک ایسے کور ذوق ڈپٹی کمشنر سے سابقہ پڑ گیا تھا جس نے رائل پارک کی کسی موسیقی نواز عمارت میں چھاپہ مار کر ایسی حرازادیوں کا ایک گروہ گرفتار کر لیا تھا جو ناز و ادا کا کاروبار کیا کرتی تھیں اور اس مقدمہ کی لپیٹ میں بہت سے اونچی ناک والے بھی آ گئے تھے۔ اس طرح چند دنوں کے لئے رائل پارک سے رقص و نغمہ کی محفلیں اُٹھ گئی تھیں لیکن اب پھر ضرورت ہے ایک اسی قسم کے ڈپٹی کمشنر کی جو ان معزز خواتین کی نئی پود کے مشاغل کا سراغ لگا کر دیکھے کہ ان طبلوں کی تھاپ کے پیچھے کتنے دل دھڑکتے ہیں؟ اور کتنے اونچے خاندانوں کی عزت لرز رہی ہے -

رائل پارک میں ان دنوں بہت سی تھیٹر کمپنیاں بھی کھل گئی ہیں - مصر اور ریڈ کراس کی امداد کے خوبصورت پردے کے پیچھے ان کمپنیوں میں روزانہ خواتین تشریف لاتی ہیں اور "رائل پارک" ہو کر رہ جاتی ہیں -

پچھلے دنوں اپنے ماں باپ کی ایک سعادت مند بیٹی نے رائل پارک

ہیں قدم رکھا تو ایک دفتر کی سیڑھیاں اترتے اُترتے ایک دم پھسل کر ہسپتال پہنچ گئی تھی معلوم ہُوا کہ اس دفتر کی سیڑھیوں پر بھنگ کا پلستر کیا گیا تھا۔ اور اس پلستر سے پھسل کر بہت سی لڑکیاں ہسپتال پہنچ جاتی ہیں۔

○

چھوٹی چھوٹی تنگ و تاریک گلیاں جب چوراہوں سے جا ملتی ہیں تو بازار بن جاتی ہیں اور بازار جب پُررونق چوراہوں میں پہنچتے ہیں تو وہاں سے نکلنے والی چاروں راہیں سیاست کے بلند ایوانوں کی طرف رہنمائی کرنے لگتی ہیں لیکن نسبت روڈ کے چوک سے میکلوڈ روڈ اور ایبٹ روڈ کو جانے والی سڑکیں جب گھوم پھر کر دوبارہ اپنے مرکز پر جمع ہو جاتی ہیں تو راستہ چلنے والے ایک بار پھر لکشمی چوک پہنچ جاتے ہیں جو لکشمی دیوی کے مجسمہ والی عمارت کی وجہ سے مشہور رہے۔ لیکن اس عمارت سے لکشمی خفا ہو گئی ہے اور مادام مسلم لیگ کے پُرانے آشنا اپنی شاہانہ مونچھوں اور خوبصورت شیروانیوں سمیت اسے منانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ لکشمی دولت کی دیوی کو کہتے ہیں اور اس دیوی کی بے وفائی تو بڑے بڑے جانبازوں کے بھی بس کی بات نہیں اور لبس کی بات اسے کہتے ہیں جو اس عمارت کے ساتھ والے

ادمنی بس سٹاپ پر کھڑے ہو کر کی جاتی ہے۔ یہ بات کرتے ہوئے عموماً بس کا انتظار کیا جاتا ہے اور کسی بلند پایہ فلمی شاعر کا یہ مصرعہ گنگنایا جاتا ہے ع

"یہ بے لبسی کا عالم یہ بے لبسی کی دنیا"

بے لبسی کا عالم نہ پوچھئے۔ مجھے ایک ایسا عالم یاد آ رہا ہے۔ جب مادام مسلم لیگ کی سیاسی فرم کے کلرکوں کو تنخواہ نہیں ملتی تھی اور ڈائرکٹر لوگ اپنی اپنی کاروں میں اڑتے ہوئے کسی کاروباری فرم کے حصے خریدنے میں مصروف رہتے تھے۔

یہ کلرک جب بھی آپ کے اس خادم سے ملے ہیں ان کے چہروں پر مسلسل فاقہ کشی کے سائے ہوتے تھے اور ان کے مقابل مادام لیگ کے چاہنے والے لائسنس اور پرمٹ لئے بنک بیلنس سے عشق فرما رہے تھے۔

یہ عشق فرمانا بھی کچھ عجیب سا ہو گیا ہے۔ لاہور کی گلیوں اور بازاروں نے مجنوں، فرہاد اور رانجھوں تو پیدا نہیں کئے مگر پرویز اور قیصر ضرور پیدا کئے ہیں جو ہر زمانے میں خون کا پیالہ پینے کی بجائے دودھ کے پیالے کو اندھے کی ریوڑی سمجھ کر ہڑپ کر جاتے تھے۔

اب ہی بات ان گلیوں اور بازاروں کی تو حضور سُنیے۔

ان گلیوں اور بازاروں میں ایسے انسان بھی موجود ہیں جنہوں نے مسلم لیگ کی آواز میں اپنی آواز شامل کی اور پاکستان بناتے بنانے ہندوستان سے لے کر واگہہ تک اُن کی قبریں بن گئیں — چاہیئے تو یہ تھا کہ ان قبروں میں سونے والے لوگوں کے پاکستان کو خوشحال بنایا جاتا لیکن مادام مسلم لیگ کے چاہنے والے ان قبروں کے مجاور بن گئے اور لکشمی دیوی کی پوجا کرنے لگے۔ اب بھی لکشمی دیوی کے آنچلوں کی چھاؤں میں سیاسی جوڑ توڑ ہوتے ہیں اور مادام مسلم لیگ ایک مرتبہ پھر گلیوں اور بازاروں کے آزاد لوگوں کو اپنی زلف گرہ گیر میں اسیر کرنے کیلئے مسکرا رہی ہے۔

پچھلے دنوں لاہور میں مادام مسلم لیگ لکشمی دیوی کے دامن سے نکل کر ذرا دیدار عام کے لئے منظر عام پر آئی تو لوگ اس کی ٹک ٹک سے حیران رہ گئے ایک منچلے نے کہا۔

"بوڑھی گھوڑی ۔لال لگام"

کاش مشہور سیاسی کارکن لال دین قیصر مرحوم زندہ ہوتے تو یقیناً لال لگام دیکھ کر کہتے ہے

تڑپنے والے تڑپ کر فلک کو چھو آئے
اُترنے والے ابھی تک نہ بام سے اُترے

بام سے اترنے والی بات گو پرانی ہے لیکن اس انداز سے نئی ہے کہ ہاد ام مسلم لیگ بام سے اترنے کی بجائے وہاں سے جھانک رہی ہے۔ لیکن گلیوں اور بازاروں میں جھانکنا بہت ضروری ہے میں جانتا ہوں۔

ان گلیوں اور بازاروں کے تاریک گوشوں میں زندگیاں سکون کی تلاش میں اپنے خدا کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ اور گلیوں اور بازاروں سے دور رہنے والے اقتدار کی کرسیوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

لکشمی بلڈنگ جس کے دروازے پر حلیم فروخت ہوتا ہے جسے کھانے کے بعد تنک مزاج آدمی بھی حلیم الطبع انسان بن جاتے ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی تو وہ عبدالحلیم بھی کہلانے لگتے ہیں۔ عبدالحلیم نہیں جانتا تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب اس شاندار عمارت میں بیٹھ کر سرگوشیاں کرنے والی مخلوق کو بھی حلیم کھا کر عبدالحلیم بننے والے لوگوں کی ضرورت محسوس ہوگی۔

بیڈن روڈ

مائل پارک جہاں سے شروع ہوتا ہے وہیں پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے اس سے آگے جو سڑک ہے اسے بیڈن روڈ کہتے ہیں۔ بیڈن روڈ کی سب سے مشہور چیزیں مچھلی۔ کباب اور جوتوں کی دکانیں ہیں۔ اِن دکانوں پر بین الاقوامی جوتوں کا کاروبار تو نہیں ہوتا البتہ یہ جوتے کبھی کبھی ان نوجوانوں پر برس جاتے ہیں۔ جو سرِ بازار لڑکیوں سے دل کی بات کہہ دیتے ہیں اور دل بہر حال دل ہے سنگ و خشت نہیں جس پر حسن فراواں کارگر نہیں ہوتا۔

جوتوں کے ساتھ ساتھ اس بازار میں حسن کی بھی فراوانی ہے لیکن بقول شاعر ؎

حسن تمکین و ناز فرمائے   اور دل ہے کہ دیکھا جائے

اس بازار میں انجمن چندہ پسند مصنفین کے مرکزی دفاتر بھی ہیں جو ٹی ہاؤس کا بل بڑھ جانے پر قوم کے نام چندہ کی اپیل کیا کرتے ہیں یہ لوگ چندہ لینے میں پیش پیش رہتے ہیں اور اگر کوئی ستم ظریف ان سے چندہ مانگ لے تو سخن دریں است والا معاملہ پیش آجاتا ہے۔ اور

ہم ٹھہرے سخن فہم۔ سخن فہمی کی بات چلی ہے تو ذرا اس کی وضاحت بھی ہو جانی چاہیئے۔ ایک طبقہ تو سخن فہم کہلاتا ہے۔ دوسرے کو (جو صرف سخن فہم نہیں ہوتا باقی سب کچھ ہوتا ہے) "غالب کے طرفدار" کہتے ہیں۔

لیکن یہ بیڈن روڈ کم بخت اتنی بدذوق واقع ہوئی ہے کہ یہاں صرف غالب کے طرفدار رہتے ہیں۔ جو مچھلی کھاتے ہیں چائے پیتے ہیں اور انگریزی بولتے ہیں ان لوگوں میں زیادہ تعداد عیسائیوں اور پارسیوں کی ہوتی ہے۔ بیڈن روڈ کی سب سے زیادہ مشہور چیز ظہیر کاشمیری ہے۔

جو انقلاب فرانس کے زمانہ کا سوٹ پہن کر امرتسری حلوائیوں کی دکان سے دودھ پیتا ہے اور بہ آواز بلند مادری زبان میں گفتگو کرتا ہے۔ کہتے ہیں ایک روز ظہیر کاشمیری بیڈن روڈ کی کئی منزلہ عمارت کے نیچے کھڑا آسمان کی طرف آنکھیں اٹھا کے گالیاں دے رہا تھا۔ قریب پہنچنے پر معلوم ہوا کہ یہ گالیاں اس فلک بوس عمارت کی آخری منزل پر کھڑے ہوئے ایک پہلوان کی طرف جا رہی تھیں ظہیر نے کہا۔

"بڑے پہلوان بنے پھرتے ہو، نیچے اُتر کر دیکھو ابھی خیریت معلوم ہو جائے گی"

"تو آؤں نیچے"۔

"آجاؤ، رعب کیا جماتے ہو"۔

ظہیر نے آستین چڑھاتے ہوئے کہا۔

"لے فیر میں آن لگا جے"۔

اور جب وہ پہلوان پچاس سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا تو ظہیر سامنے حلوائی کی دکان پر بیٹھا تھا۔ پہلوان نے کہا۔

"لو میں اب آگیا ہوں"۔

"اچھی بات ہے اب تم جا سکتے ہو کیونکہ میرا موڈ بدل گیا ہے"

بیڈن روڈ کے رہنے والے موڈ کا بہت خیال رکھتے ہیں وہاں کی ایک مخلوق درزی ہیں جو موڈ کے سلسلہ میں اتنے با اصول واقع ہوئے ہیں کہ بغیر موڈ کے ایک ٹانکہ تک نہیں لگاتے اور کبھی کبھی گاہکوں کو ان کے موڈ کا سالہا سال انتظار کرنا پڑتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ادھر آرڈر دیا اور ادھر کپڑے تیار لیکن ایسے موقعے صرف چند خوش نصیبوں ہی کو میسر آتے ہیں۔

بیڈن روڈ کی شہرت کی ایک وجہ وہاں کے حکیم ڈاکٹر اور دوا فروش ہیں لیکن ان دوا فروشوں کی بات سب سے الگ ہے۔ حکیم تو خیر خاندانی لوگ ہوتے ہیں لیکن دوا فروش جو انگریزی ادویات کی بوتلوں میں دیسی دوائیں بھرتے ہیں اور گاہک کو اس طرح دیتے ہیں جیسے اس کے آبا و اجداد کی کمروں پر احسانات کا بوجھ لاد رہے ہوں۔ ان دوا فروشوں کی دوسری خوبی یہ ہے کہ بعض ضروری ادویات ان کی دکانوں سے اکثر و بیشتر غائب رہتی ہیں اور اگر آپ کی جیب میں معمولی سے زیادہ نوٹ ہیں تو پھر کچھ مشکل بات نہیں۔ دنیا کی ہر دوا اسی دوکان سے مل جائے گی۔ صرف ایک شرط ہے۔

وہ یہ کہ دوا خریدنے کے بعد رسید کا مطالبہ ہرگز نہ کیا جائے۔

یہ دوا فروش بھی "غالب کے طرفداروں" میں شمار ہوتے ہیں

لیکن۔ ع

ہم سخن فہم ہیں "غالب کے طرفدار نہیں"

انارکلی

انارکلی ایک ایسا بازار ہے جہاں نہ کلیاں ملتی ہیں نہ ہی انار، بلکہ اس بازار میں ایسے دوست ضرور ملتے ہیں، جن کی دوستی گل انار کی مانند ہے

جو آشنائی کے رنگ سے پر ہوتی ہے۔ لیکن اس میں بوئے وفا کا نشان نہیں ملتا کیونکہ انار کے پھولوں کا رنگ جتنا شوخ ہوتا ہے۔ اتنی ہی بڑی خامی اس میں ہوتی ہے کہ ان پھولوں میں خوشبو نہیں ہوتی۔ انار کے پھول کاغذ کے تو نہیں ہوتے۔ البتہ انار کلی بازار میں کاغذ کے پھول کثرت سے فروخت ہوتے ہیں اور بقول شاعر ع

کہ خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے

انار کلی میں داخل ہوتے ہی طرح طرح کی آوازیں کانوں سے ٹکراتی ہیں

سرمہ لے، سرمی لے، کاجل لے ہسی لے،

دانتوں کا منجن ہے صاحبان، دانتوں کو چمکدار بناتا۔

منہ سے بدبو دور کرتا ——— اور

رائٹنگ پیڈ بابو جی۔

انار کلی کی قابل ذکر مخلوق وہ بچے ہیں جو آپ کو راستہ چلتے روک کر پوچھ لیتے ہیں۔

"پین پر نام لکھ دیں صاحب؟"

اگر آپ کہیں گے "نہیں" پھر وہ جواب دیں گے۔

گھڑی پر ہی نام لکھوا لیں؟"

آپ انکار کرتے جائیے وہ کہتے جائیں گے چشمہ پر نام لکھوا لیجئے۔ بلیٹ پر نام لکھوا لیجئے۔ سائیکل پر نام لکھوا لیجئے۔ یہاں تک کہ آپ تنگ آکر آگے چل دیں گے اور نام لکھنے والا آپ کے تعاقب میں چند قدم چل کر کسی اور کو گھیرے میں لے لے گا۔ اور آپ کا شمار اپنے ذہن میں ان گاہکوں کی فہرست میں درج کرے گا۔ جو نام نہاد گاہک کہلاتے ہیں۔ انارکلی میں صبح اس وقت ہوتی ہے جب لاہور کے دوسرے علاقوں میں سورج ڈوب جاتا ہے اس وقت لوگ شام اودھ کو بھول کر انارکلی کی شام کو یاد کرنے لگتے ہیں یہ بازار سامانِ آرائش کی دوکانوں اور کپڑے کی دوکانوں کے لئے مشہور ہے ان دکانوں کے شوکیسوں سے طلوع ہوتی ہوئی روشنی میں ان لوگوں کے چہرے زرد ہو جاتے ہیں۔ جن کے گھروں میں ایوننگ ان پیرس کی خوشبو پر لہسن پیاز اور ادرک کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اور اس روشنی میں وہ چہرے بہت خوبصورت ہو جاتے ہیں۔ جن پر چھائی ہوئی آنکھیں صرف زیورات کی دکانیں دیکھتی ہیں۔

اور ان کی باہوں کے ساتھ جھولتے ہوئے نیلی آنکھوں اور سنہری بالوں والے نیچے اپنے کتوں کے لئے بسکٹ خریدتے

ہیں۔بسکٹ کھانے والے کتے گلبرگ اور سول لائنز کے علاقوں سے انارکلی آتے ہیں اور چمکیلی کاروں میں بیٹھ کر انہی علاقوں کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

انارکلی کے کتنے حلوائیوں کی دکانوں پر جھوٹے برتن چاٹنے کے بعد ان کی سرد بھٹیوں میں سو جاتے ہیں اور جب یہ کتے سو جاتے ہیں تو انارکلی میں رات ہو جاتی ہے۔ رات کے وقت انارکلی کے اکا دکا ہوٹلوں سے فلمی گانوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ انارکلی کی سب سے زیادہ مشہور چیز احسان دانش ہے جو دانش گاہ میں رہتا ہے اور ممتاز ہوٹل کی گھٹی گھٹی تنگ و تاریک فضا میں بیٹھ کر کڑک چائے پیتا ہے یہ ہوٹل بھی ——— ہوٹل کم اور ریکارڈنگ ہاؤس زیادہ ہے۔ اس سے ذرا آگے وہ ہوٹل ہے جس کی پیشانی پر لکھا ہے کہ ہمیں آج تک دس لاکھ سے زیادہ شعرا کی خدمت کرنے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ یہ خدمت ان بلوں کے ذریعہ کی جاتی ہے جسے دیکھ کر مسافروں کے دل ڈول جاتے ہیں۔ اسی انارکلی میں ایک ایسا کاروبار ہوتا ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل اچھوتا ہے۔ اس کاروبار کو "ارکا بازی" کہتے ہیں۔ اس کام میں "ارکا باز" اور گھڑی ساز برابر کے شریک ہوتے ہیں اور اس شرکت محدود کا کام

اس طرح ہوتا ہے کہ راہ چلتے کوئی پردیسی اچانک راستہ روک کر کہتا ہے میں پردیسی ہوں میرے روپے چوری ہو گئے ہیں۔ کل میں نے یہ گھڑی خریدی تھی آپ آدھی قیمت پر لے لیں، میرے پاس رسید بھی ہے آپ رسید اور گھڑی لے کر گھڑی ساز کو دکھائیں گے وہ کہے گا۔ سستا سودا ہے لے لو ــــ گھڑی خریدنے کے بعد معلوم ہو گا کہ نئے کیس میں پرانی مشین بند ہے اور رسید جعلی ہے۔ پھر آپ لاکھ ڈھونڈیئے ''ارکا باز'' کا ملنا محال ہے۔

○

انارکلی کے چوک کی سب سے زیادہ مشہور چیزیں کتابوں، رسالوں اور اخبارات کے سٹال ہیں۔ ان سٹالوں کے مالکان اردو کے بڑے بڑے ناشر ہیں جو چوہدری برادری سے تعلق رکھتے ہیں اور ''ادب کے چوہدری'' کہلاتے ہیں۔

ادب کے چوہدری ان لوگوں کو نہایت صبر و تحمل سے برداشت کرتے ہیں جو ان کے سٹالوں پر محض رسائل و اخبارات کے مطالعہ کی غرض سے تشریف لاتے ہیں۔ ایسے لوگ ہر روز ایک مقررہ وقت پر آتے ہیں اور نئی کتابوں، نئے رسائل کا مطالعہ فرما کر تشریف لے جاتے ہیں۔ ان

لوگوں میں زیادہ تعداد ان کی ہوتی ہے جو فلمی رسائل میں سوال و جواب کے کالموں میں اپنے نام دیکھنا چاہتے ہیں۔ دوسری قسم ان لوگوں پر مشتمل ہے جو سکول کی دیواروں سے نکلتے ہی ادب تخلیق کرنا شروع کر دیتے ہیں اور مدیرانِ جرائد انہیں اعزازی پرچے نہیں بھیجتے اسی لئے بیچارہ کو ہر روز چوک انار کلی کے بک سٹالوں کا طواف کرنا پڑتا ہے۔ اس چوک میں پرانے ناشروں سے ان ناشروں تک کی دکانیں ہیں جو اپنے آپ کو خدا اور ادب کے نقیب گردانتے ہیں۔ قدو قامت کے لحاظ سے ادب کی تخصیص کرنا کچھ ان چوہدری لوگوں ہی کے حصہ میں آیا ہے ویسے اس میں شک نہیں ان اشاعت کدوں سے جو کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ انہوں نے فن طباعت میں ایک اچھوتے اور خوبصورت انداز کی بنیاد رکھی ہے۔

اسی چوک کے گردو نواح میں ایسے ناشر بھی موجود ہیں۔ جو مصنفین کی حق تلفی کو اپنا فرض جانتے ہیں اور ہندوستان کی کتابیں بلا اجازت شائع کر کے ہندوستان کے ناشروں کے لئے راستہ صاف کرتے ہیں۔
تاکہ وہ بھی پاکستانی مصنفین کی کتابیں بلا اجازت شائع کرتے ہیں

ان ناشتوں کے ساتھ وہ حلوائی بھی موجود ہیں۔ جن کی غلیظ دکانوں پر خالص دیسی

گھی کی مٹھائیوں کے شاندار بورڈ آویزاں ہیں —— اور

اندر خالص نباسپتی تیل استعمال ہوتا ہے۔ ان دکانوں پر

زیادہ تر مسافر لوگ صحت بنانے کی توقع لے کر آتے

ہیں اور بیمار ہو کر جاتے ہیں یہ دکانیں کارپوریشن کے

ملازموں کی نگاہوں سے اوجھل تو نہیں البتہ وہ اس طرف

دیکھنا پسند نہیں کرتے کیونکہ انہیں جو مٹھائیاں مفت مہیا

کی جاتی ہیں ان میں واقعی دیسی گھی استعمال ہوتا ہے۔

اسی چوک میں تانگوں کا اڈہ اور ٹیکسی سٹینڈ بھی ہے جہاں سے

دو آنے سواری بیٹھ کر لوگ شہر کے دوسرے علاقوں میں جاتے ہیں۔

اس چوک کی سب سے زیادہ شہرت ان اشتہاری دوافروشوں

کی وجہ سے ہے جو امراض مخصوصہ کے فحش اشتہار چھپوا کر اپنے ایجنٹوں

کے ذریعہ راہگیر عورتوں، بچوں اور طالب علموں میں بلاتمیز مذہب و ملت

تقسیم کرتے ہیں اور اس طرح اپنی ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کے علاوہ

مستقبل کے کمسن معماروں میں جنسی بیماریوں کا شعور پیدا کرنے کا مقدس

فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ ایسے دوا فروش ایک مسلم لیگی ہوٹل کے کمرے میں رہتے ہیں اور اسی قسم کے دوسرے ہوٹلوں میں ایک اور مقدس فرقہ رہتا ہے جو ہاتھ دیکھ کر مقدر کی باتیں بتا دینے کا دعویدار ہے۔ یہ لوگ محبت۔ شادی اور روزگار کے تعویذ بھی عنایت فرماتے ہیں۔ــــ اور

ایسا کرتے ہوئے انہیں بالکل پرواہ نہیں ہوتی کہ قوم کو اوہام پرستی کی دلدل میں دھکیلنے میں یہ لوگ کتنا نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔

عوام کا مقدر بنانے والے نجومیوں کا اپنا مقدر اتنا زنگ خوردہ ہو چکا ہے کہ وہ مدتوں ان کمروں کا کرایہ ادا نہیں کر پاتے جہاں ان کے کاروبار کا صدر مقام ہے۔

ان کمروں کے ریشمیں پردوں کے پیچھے سیاہ برقعوں میں لپٹی ہوئی نیک چلتی لڑکیاں اپنے خاوندوں کے روزگار کی ترقی کے لئے تعویذ لینے آتی ہیں اور خدا جانے نجومی لوگ انہیں کیا کہتے ہیں کہ پھر ہر شام وہ اس کمرہ میں پہنچنے لگتی ہیں اور رفتہ رفتہ

انہیں اپنے خاوندوں کے روزگار میں ترقی کا خیال آنا بند

ہو جاتا ہے۔ اور نجومیوں کے روزگار میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہونے لگتی ہے۔

شاہ عالم مارکیٹ

شاہ عالم مارکیٹ جو کسی زمانہ میں اگلے وقتوں کی یادگار تھی۔اب ایک جدید طرز کی مڑک بن گئی ہے۔ جس کے دونوں جانب سرسبز باغیچے ہیں نیلگوں روشنی کے پس منظر میں عالیشان عمارتیں دیکھ کر کلکتہ کی چورنگی یاد آجاتی ہے لیکن یہ چورنگی نہیں بلکہ دورنگی آبادی ہے جسے دیکھ کر کسی مرحوم کا یہ شعر یاد آجاتا ہے ؎

دو رنگی چھوڑ کر یک رنگ ہو جا
سراسر موم ہو یا سنگ ہو جا

یہاں ایک گروہ ایسا رہتا ہے جو موم کی ناک کہلانے کا مستحق ہے کہ جدھر چاہا موڑ دیا، اس گروہ کا تعلق معمّہ باز کمپنیوں اور امدادی کمیٹیوں سے ہے شاہ عالم مارکیٹ کو اگر بین الاقوامی امدادی کمیٹیوں معمہ کمپنیوں اور سٹہ کمپنیوں کا مرکز قرار دیدیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ معمہ اسے کہتے ہیں کہ جو سلجھائے نہ سلجھے بھارت سے اس عظیم

کاروبار کو دیس نکالا دینے کے سامان کئے جا چکے ہیں۔ اسی لئے اب معمہ بازی کی تحریک بھارت سے ہجرت کر کے پاکستان میں پناہ لینے آئی ہے اور پاکستان کا بے پناہ زرمبادلہ چور دروازوں سے بھارت کو منتقل کیا جا رہا ہے۔ ایک روپیہ کے بدلے ایک لاکھ روپیہ ملنے کی امید کی مثال زلف جاناں کی سی ہے ؎

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
زلفِ جاناں کے سب اسیر ہوئے

ان معمہ بازوں کے بڑے بڑے دفاتر کی چھاؤں میں امدادی کمیٹیوں کے بورڈ بھی آویزاں ہیں جو امداد باہمی کے اصولوں پر چل کر اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے دکھ درد کا ازالہ کرتے ہیں۔ اسی شاہ عالم مارکیٹ کی دوسری قابل ذکر چیز حج کے دفاتر ہیں۔ یہ لوگ ہر اس بلی کو جو نو سو چوہے کھانے کی روایتی تعداد پوری کر چکی ہو فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے بھیجنے کا انتظام کرتے ہیں پچھلے برس ایسی ہی کمپنی نے حاجیوں کا ایک کارواں لاریوں پر روانہ کیا تھا جو کہ کوئٹہ پہنچ کر واپس لاہور آگیا تھا۔ کیوں کہ حاجیوں میں بعض ایسی بلیوں کا نام دلشاں تک نہ تھا جو نو سو چوہے کھا کر حج کو جایا کرتی ہیں۔ بہرکیف اچھا ہوا کہ منتظمین کو بر وقت اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور وہ وہیں پہنچ گئے۔ جہاں

سے چلتے تھے بقول کسے دنیا گول ہے اور گول مال کے بغیر دنیا داری نبھ نہیں سکتی۔ گول مال کے سلسلہ میں شاہ عالم مارکیٹ کے اشتہاری دفتروں کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہوگی، یہ لوگ شادی بیاہ کے ذریعے قوم کے گھر آباد کرنے کے دعویدار ہیں اور ان کے توسط سے کی گئی "شادی خانہ آبادی" عموماً خانہ بربادی ہی ثابت ہوتی ہے۔ ان کی طرف سے اشتہاروں میں اعلان کیا جاتا ہے کہ خط و کتابت صیغہ راز میں رکھی جائے گی اور جب بھولے بھالے والدین ان کی باتوں میں آکر اپنے سر کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے ان کی امداد طلب کرتے ہیں تو یہ لوگ ان کے "راز دل" کو کمزوری سمجھ کر اپنی گرہ سے باندھ لیتے ہیں۔

دفتر شادی کے علاوہ شاہ عالم مارکیٹ کی مشہور چیز فلمی رسائل کے دفتر ہیں جہاں سے فلم کے متعلق جملہ راز و درون پردہ معلوم کئے جا سکتے ہیں اور فلم ایکٹر بننے کے شوقین نوجوانوں کو "صراط مستقیم" بھی وہیں سے دکھائی جاتی ہے۔ یہ کام ایک ثانوی شعبہ سرانجام دیتا ہے جو "نئے چہروں کی ضرورت" کے عنوان سے اشتہار دیا کرتا ہے اور پرائے پاپیوں کی جیب گرم کرتا ہے۔

فلمی رسائل کے علاوہ وہاں ایک صالح اخبار کا دفتر بھی ہے

جو صالحیت سے ہٹ کر کوئی خبر نہیں دیتا، اور ہر کالم میں صالح صحافت کی ترویج۔ اشاعت پر زور دیتا ہے اس اخبار کا نصب العین جاننے سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ جہاد کشمیر کو غیر شرعی بھی اسی اخبار کی طرف سے قرار دیا گیا تھا۔

شاہ عالم مارکیٹ کی سب سے زیادہ مشہور چیز فلک لوس ہوٹل ہیں جہاں کبھی کبھی پولیس اچانک چھاپے مار کر نیک چلن اور بلند اخلاق مسافروں کے لئے مہیا کی ہوئی شراب اور عورتیں برآمد کر لیا کرتی ہے۔ اور جہاں شاہ عالم مارکیٹ ختم ہوتی ہے وہاں سے رنگ محل کا چوک شروع ہو جاتا ہے۔ اس چوک میں محل تو ایک بھی دکھائی نہیں دیتا۔ البتہ رنگ رلیاں منانے والی مخلوق کثرت سے پائی جاتی ہے یہ مخلوق ایاز کی آخری قیام گاہ کے زیر سایہ آباد ہے۔ ایاز کے مقبرے میں مٹی کے چراغوں کی روشنی دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ابھی تک محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے نہیں ہوئے وہاں اب بھی پنجاب کے گورنر کی عظمت کی بجائے ایک غلام کی عاجزی کے آثار ملتے ہیں اور محمود کی محبت پال کھوئے ہوئے ہے، ادھر ادھر جہاں دیکھیں ایک ویرانی مسلط ہے۔

بھاٹی چوک

بھاٹی دروازہ کا چوک ایک مخصوص معاشرت اور فضا کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے اس چوک کی سب سے زیادہ مشہور پیداوار پہلوان ہیں جو دنیا بھر کے پہلوانوں میں سب سے اونچا مقام رکھتے ہیں اور خود مقاماتِ آہ وفغاں سے نہیں نکل پاتے۔

آہ وفغاں کے مقامات وہ ہوتے ہیں جہاں قدم قدم پر راشن ڈپو ملتے ہیں ان ڈپوؤں سے ناقص آٹا اور گلی سڑی گندم مہیا کی جاتی ہے تاکہ قوم کے نونہالوں کو اپنی صحت کی طرف سے مکمل فراغت نصیب ہو جائے۔

فراغت اور پہلوانی میں بہت قریبی تعلق ہے۔ قیام پاکستان سے قبل ہمارے پہلوانوں کو والیانِ ریاست کی طعام گاہوں اور اکھاڑوں میں پناہ ملتی تھی اور اب جب سے پاکستان بنا ہے پہلوان بیچارے لاہور میں رہتے ہوئے بھی پناہ گیر بن گئے ہیں۔ حکومت کی طرف سے باڈی بلڈروں کی پشت پناہی تو کی جاتی ہے لیکن وہ پہلوان جو صدیوں سے اس علاقہ کی شہرت کا سبب ہیں ان پر نظر کرم خدا جانے کب ہوگی۔ گزشتہ

دنوں رستم زماں گاماں پہلوان کارپوریشن کی ممبری کے امیدوار تھے۔ لیکن وہ انتخاب ہی نہیں ہوا۔ ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

بہر حال گاماں پہلوان کو چاہیئے کہ اگر وہ "موری ممبر" بن گئے، تو بھاٹی دروازہ کے پہلوانوں کے راشن پانی کا انتظام کریں۔

بھاٹی دروازہ کے چوک کی دوسری مشہور چیز شربت انناس کی دوکانیں ہیں جن پر مشہور پہلوانوں کی قد آور تصویریں لگتی رہتی ہیں۔ ان دکانوں میں ایک دوکان ایسی ہے جو شربت سے زیادہ عجائبات اور سامانِ آرائش کی دکان معلوم ہوتی ہے۔ وہاں بیتل کے سنہری محل تاج محل کا نمونہ اور قدِ آدم پتلیں اور ان کے پس منظر میں آئینے لگے ہوتے ہیں۔ لوگ ان آئنوں میں اپنی شکل دیکھتے ہیں اور شربت پینے کے بعد ثریا کباب کھانے لگتے ہیں۔

ثریا کباب بھاٹی دروازہ کی مشہور صنعت ہے کبابوں کی اس دوکان پر فلمی اداکارہ ثریا کی بے شمار تصویریں آویزاں ہیں اور کباب فروش سال بھر میں ایک مرتبہ ثریا کی سالگرہ مناتا ہے اس تقریب میں اپنے پڑوسی دکانداروں اور ثریا کے دیرینہ معتقدوں

کو مفت کباب کھلاتا ہے اور بوڑھا کباب فروش نوجوان ثریا کی ہر فلم دیکھتا ہے اس کے ساتھ پانوں کی ایک مشہور دکان ہے جو دارالسرور کے نام سے منسوب ہے۔ دارالسرور کے پانوں سے زیادہ پانفروش کا ذکر اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ چالیس سالہ تندرست توانا شخص دسمبر جنوری کی کہر اور دھند میں بھی صرف ایک بنیان پہنے رکھتا ہے اور اس کا جسم بالکل گرم ہوتا ہے ان دکانوں پر سر شام بھاٹی دروازہ کے زندہ دل مختلف گروہوں میں کھڑے ہو کر سیاست فلم اور پہلوانی کے موضوع پر تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ شربت انناس پیتے ہیں اور نورافشاں ہوٹل کے وسیع ہال میں سما جاتے ہیں جہاں رات گئے تک لاؤڈ سپیکر چیختا رہتا ہے اور سامعین کو اتنے فلمی گانے سناتا ہے کہ انہیں ان گانوں سے نفرت ہو جاتی ہے رنگ برنگے لباسوں جگمگاتی روشنیوں اور داتا دربار کے مخصوص کرداروں پر مشتمل چوک دن سے زیادہ رات کو بارونق ہوتا ہے۔ وہ موسم داتا دربار کے عرس کا موسم کہلاتا ہے جب سینما گھروں کے ساتھ ساتھ کھیل تماشوں کے لئے قناطیں لگا دی جاتی ہیں۔ سرکس کے کمالات سے تین سروں والے مرد اور ایسی عورتوں کی نمائش ہوتی ہے جن کا آدھا جسم مچھلی کی مانند ہوتا ہے اسی علاقہ میں

عرس کے دنوں میں موت کا کنواں بھی دیکھا جاتا ہے جس سے زندگی کی غاریں اناج بھرنے کے سامان کئے جاتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے تھیٹروں میں دیہاتی لوگ دو آنہ ٹکٹ خرچ کر کے جاتے ہیں اور حلوہ پراٹھا کھانے کے ساتھ ساتھ محفل رقص و سرود اور جادو کے کمالات سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

یوں تو اس چوک پر ہر جمعرات کو میلہ لگتا ہے اور حضرت علی ہجویری کے مزار کی زیارت کرنے والے لوگ جوق در جوق وہاں سے گزرتے ہیں لیکن عرس کے دنوں کی بات ہی اور ہے اور وہ بات تو بہر حال عرس ہی کے دنوں میں سنائی جا سکے گی۔ آج قارئین کو اتنی ہی سیر پر کفایت کرنا چاہیئے۔

○

روزنامہ "آزاد" لاہور
جنوری ۵۰ء

اپنے نام ایک خط

میں نے تمہیں ان دنوں بھی دیکھا تھا جب تمہاری ننھی ننھی انگلیاں روشنائی سے بھری رہتی تھیں اور تم گورنمنٹ سکول کی ڈیسک پر بیٹھے ماسٹر بابو رام کو دل ہی دل میں کوسا کرتے تھے۔ تم میرے ساتھ ہی پیدا ہوئے اور میرے ساتھ ہی مروگے۔ ایسا بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ تم مجھے نہ جانتے ہو؟

پیارے اکرام لدھیانوی!

یہ نومبر کی ایک خاموش رات ہے اور میں اپنے کمرے میں اکیلا لیٹا ہوا ہوں۔ کمرے کی وہ کھڑکیاں بند ہو چکی ہیں جو بازار کی طرف کھلتی ہیں۔ سامنے کی دیوار سے چپکا ایک بوڑھا کلاک نو بجا رہا ہے۔ اور لکڑی کی سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔ شاید کوئی آ رہا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم ہی آ جاؤ اور اپنی نیلگوں عینک اتارتے ہوئے کہو کہ ابھی سے کھڑکیاں کیوں بند کر دی ہیں۔ ابھی تو بازار بھی پوری طرح بند نہیں ہوا۔ بازار سے گزرتی ہوئی اکا دکا کاروں کے ہارن سنائی دے رہے ہیں۔ کبھی کبھی کسی گھوڑے کے سرپٹ دوڑنے کی آواز سے میں چونک

اُٹھتا ہوں اور مجھے خیال آجاتا ہے کہ سیڑھیوں کے راستے ابھی تک کوئی نہیں آیا اور آہٹ ختم ہو چکی ہے۔ سیڑھیوں کے نیچے ایک ہوٹل کا باورچی خانہ ہے جہاں سے دن بھر تیز مصالحوں کی بُو آتی رہتی ہے۔ بازار میں جانے کے لئے باورچی خانہ سے آگے ایک پھاٹک سے گزرنا پڑتا ہے جہاں چھالیہ کی بوریاں پڑی رہتی ہیں۔ اور بارہ آنے روز لینے والے لڑکے چھالیہ کترتے کترتے اپنی انگلیاں کُتر لیتے ہیں۔ یہ بوریاں حافظ جی کی ہیں جنہوں نے پھاٹک میں دکان کھول رکھی ہے۔ تمباکو کے رنگ برنگے ڈبوں کے ساتھ ہی شیشے کا ایک شوکیس ہے جس کے پیچھے نظیر گھڑ یساز بیٹھا رہتا ہے۔ یہ پھاٹک جو اب تین چھوٹی چھوٹی دکانوں میں بدل چکا ہے۔ دن بھر لوگوں سے بھرا رہتا ہے۔ تیسری دکان جھنڈا میاں کی ہے جو گھڑیوں کے فیتے فروخت کرتے ہیں۔ جھنڈے کے ساتھ وزن اور تقدیر کا کارڈ نکالنے والی سرخ مشین لیٹر بکس کی طرح کھڑی رہتی ہے اور گزرنے والے لوگوں کو ایک آنے میں تقدیر کا حال بتاتی رہتی ہے۔ یہ مشین کسی اور شخص کی ہے۔ جو ہر دوسرے دن آکر ایک چھوٹی سی چابی سے ڈھیر ساری ریزگاری

نکال کر گننے لگتا ہے اور حافظ جی کا باپ کہتا ہے "مشین کیا ہے کماؤ بیٹا ہے۔ اسے اپنے کماؤ بیٹے پہ بہت ناز ہے جس کے پاس ہر ہفتے پراسرار قسم کے لوگ آتے ہیں جو تین تین دن تک کمرے سے باہر نہیں نکلتے اور کماؤ بیٹے کو انہیں الوداع کہنے کے لئے بارڈر تک جانا پڑتا ہے حافظ جی کا باپ دہلی کا مہاجر ہے۔ جہاں وہ عینک سازی کا کام کیا کرتا تھا۔ ان دنوں حافظ جی اور ان کا بھائی بہت چھوٹے تھے۔ یہاں آکر دونوں بھائیوں نے چھالیہ کتھہ کا چھوٹا سا کام شروع کیا اور اب ان کے پاس اتنا مال ہے کہ دکان کے پیچھے چھالیہ کی بوریوں کا گودام بھرا رہتا ہے اور وہ بوریوں کو صرف اپنے سامنے ایک بند کمرے میں کھولتا ہے۔ بوریوں کی دیوار اونچی چھت تک پہنچ گئی ہے اور راستے میں اتنے لوگ کھڑے رہتے ہیں کہ گزرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ حافظ جی کے بھائی کو نظیر گھڑی ساز نے دلیپ کمار کا خطاب دے رکھا ہے کیونکہ وہ ہر اتوار کو سمر سوٹ پہن کر پلازا میں انگریزی فلم دیکھنے جاتا ہے اور منگل اور جمعرات کے روز فرمائشی گانوں کا پروگرام ضرور سنتا ہے۔ حافظ جی کا باپ جس کا رنگ

سیاہ اور بال سفید ہوتے جا رہے ہیں کشمیری سٹال سے کڑک چائے بہت پیتا ہے اور کبھی کبھی لوگوں کی عینک بھی بنا دیتا ہے ایک روز وہ مجھے گورنمنٹ ہاؤس کے قریب ایک ڈاکٹر کی کوٹھی پر مل گیا اور کہنے لگا کہ ڈاکٹر صاحب نظر کا امتحان کرنے کی فیس ڈیڑھ سو روپے لیتے ہیں لیکن اپنے مہربان ہیں۔ اس لئے تمہارا کام مفت کرادوں گا۔ یہ کام مفت کرانے کے بعد انہوں نے مجھ سے عینک کے دام لے لئے۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ موصوف کے دوست انہیں پیار سے شہنشاہ کہتے ہیں شہنشاہ اکثر لوگوں کو اسی طرح عینک لگوایا کرتے ہیں۔ اس وقت جھنڈا جا چکا ہوگا۔ اور شہنشاہ اس کی دکان کے خالی تھڑے پر بیٹھا ہر آنے جانے والے کو بلاوجہ گھور رہا ہوگا۔ حافظ جی جو ہر وقت ہنستے رہتے ہیں نظیر سے کسی نئی فلم پر تبادلہ خیال کر رہے ہوں گے۔ نظیر ریاست پٹیالہ سے مہاجر بن کر یہاں آیا تھا اور اس نے بھی حافظ جی کے ساتھ ہی گھڑیوں کا چھوٹا موٹا کام شروع کیا تھا۔ اور اب جس وقت وہ دکان سے اٹھ کر جاتا ہے، تو وہ گھوڑا بوسکی کی قمیض نوٹوں کے وزن سے بوجھل ہوتی ہے

پھاٹک میں بیٹھنے والے تینوں دوکاندار مجھے اچھی طرح جانتے ہیں اور میں حسبِ توفیق ان سے قرض بھی لیا کرتا ہوں۔ لیکن وہ کبھی تقاضا نہیں کرتے۔ جب کئی مہینے گذر جاتے ہیں اور میں گذرتے ہوئے سلام دعا بھی کرنا چھوڑ دیتا ہوں۔ پھر بھی وہ سگریٹ کی ڈبیہ پر لکھا ہوا رقعہ دیکھ کر قرض دے دیتے ہیں اور کبھی کبھی یونہی مجھے آواز دے کر روک لیتے ہیں۔

کیوں جی بھائی صاحب!

فرمائیے جناب مزاج اچھے ہیں۔

آپ سنائیے آج کل کیا کر رہے ہیں۔

بس جی ایک ناول لکھا ہے چند روز میں روپے مل جائیں گے

نہیں جی روپوں کی کیا بات ہے آپ تو بس —" اور پھر وہ اپنے گاہکوں میں مصروف ہو جاتے ہیں اور میں یہ سوچتا ہوا لکڑی کے زینہ پر چڑھنے لگتا ہوں کہ روپے کی کیا بات ہے۔ حالانکہ ساری باتیں روپے کی ہیں۔

سو میرے پیارے اکرام لدھیانوی روپیہ حاصل کرنے کے لئے تم نے وہ ناول ایک ناشر کو دے دیا ہے۔ جس نے

پڑھنے کے بعد کہا تھا کہ ناول میں خوبیاں بھی ہیں خامیاں بھی ہیں۔ پھر آپ کی پہلی کتاب ہے اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ناول پڑھنے کے بعد ناشر کبھی بھی یہ نہیں کہے گا ــــ "واہ سبحان اللہ۔ بہت اچھا ناول ہے"۔ ایسا کہنے سے اُسے مصنف کو زیادہ دام دینے پڑتے ہیں۔ میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر یہ ناول اس ناشر کو پسند نہ ہوتا تو اسے کبھی شائع کرنے پر تیار نہ ہوتا۔ مگر اس کے باوجود تم دائمی حقوق کے لئے ایک حقیر سی رقم لینے پر آمادہ ہو گئے۔ تاکہ تم سردیوں کے لئے گرم کپڑے بنا سکو۔

میرا خیال ہے مجھے اپنا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں۔ ایسا بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ تم مجھے نہ جانتے ہو تم میرے ساتھ ہی جاؤ گے۔ میں نے تمہیں ان دنوں میں بھی دیکھا ہے۔ جب تمہاری ننھی ننھی انگلیاں نیلی سیاہی سے بھری رہتی تھیں اور تم گورنمنٹ سکول کی ڈیسک پر بیٹھے ماسٹر بالورام کو دل ہی دل میں کوسا کرتے تھے جو کلاس روم میں آتے ہی تمہیں ڈیسک پر کھڑا کر دیتا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب تمہاری آنکھوں پر عینک کا خول نہیں چڑھا تھا، اور تم پانی پت کی تیسری جنگ یاد کیا کرتے تھے۔ پانی پت کی جنگوں کا حال

تمہیں کبھی یاد نہیں ہوتا تھا اور تم رسالہ پھول کے لئے مضمون لکھنا یاد رکھتے تھے۔ مجھے وہ دن بھی یاد ہے۔ جب اردو کے ٹیچر نے تم سے پوچھا تھا۔ ریلوے اسٹیشن پر مضمون لکھ لیا؟ تم نے دور ہی سے اثبات میں سر ہلا دیا اور ٹیچر کے کہنے پر کاپی نکال کر سنانے لگے تم مضمون سنانے میں اتنے مشغول تھے کہ تمہیں اس کا بھی احساس نہیں رہا کہ ٹیچر اپنی جگہ سے چل کر تمہارے پیچھے آگیا اور وہ دیکھ رہا تھا کہ تم۔ نے مضمون نہیں لکھا بلکہ کاپی کے سادہ ورق الٹتے ہوئے زبانی مضمون سناتے جا رہے ہو۔

یہ بات تو یونہی چھڑ گئی مجھے دراصل یہ کہنا ہے کہ تم جو بہت دنوں سے دکھائی نہیں دیتے تو کیا تم زندہ بھی ہو کہ نہیں؟ اگر ہو تو پھر ہونے کا ثبوت کیوں نہیں دیتے۔ تم اس روز ناشر کی دکان سے نکل کر گئے تھے اس کے بعد میں نے تمہیں نہیں دیکھا۔ تمہارا افسانہ نگار دوست کل رات گئے تک تمہارے انتظار میں سامنے کی دکان کے تھڑے پر بیٹھا "گتے ڈو" کے سگریٹ پیتا رہا۔ اس نے سفید پتلون پہن رکھی تھی اور وہ دیر تک مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ وہ

اپنے ناول کا مسودہ دو ناشروں کو دکھانے کے بعد تیسرے ناشر کو دے آیا تھا اور کہہ رہا تھا کہ میں تیسرے ناشر کے عنوان سے ایک مضمون لکھوں گا جس میں تینوں ناشروں کی روئداد درج ہو گی۔ تمہارا مضمون نگار دوست بہت دلچسپ آدمی ہے۔ وہ باتیں بھی مضمون کی طرح کرتا ہے۔ کل جب میری اس کی ملاقات ہوئی تو وہ تمہاری تلاش میں ہال روڈ سے آیا تھا۔ میں لے تمہارے بارے میں بتایا کہ اسوقت وہ عموماً مال روڈ کے کسی ہوٹل میں ہوتا ہے۔

اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں داتا صاحب جا رہا ہوں۔ میں نے کہا اچھی بات ہے میرے لئے بھی دعا کرنا۔ یہ سن کر اس نے جواب دیا کہ میں داتا صاحب دعا کرنے نہیں جا رہا بلکہ نیا بوٹ چرانے جا رہا ہوں۔

ہمیشہ کی طرح صبح بھی اس کے ہاتھ میں کاغذوں کا بنڈل تھا اور کوٹ کی جیب میں روشنائی کی شیشی تھی اس نے کہا بچوں کے عالمی ادارے کی طرف سے جو مہمان کھلونے لے کر پاکستان آیا ہے۔ میں اس کے نام ایک خط لکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس سے پوچھنا ہے کہ یہ ہزاروں ڈالر کے کھلونے آخر کون سے پاکستانی بچوں میں تقسیم کئے جائیں گے۔ کیا کوچہ سر کی ہنداں میں ننگے پیر گلی ڈنڈا کھیلنے والے بچوں کو یا ان کو جن کے پاس پہلے ہی بہت سے کھلونے ہیں اور جن کے لئے زندگی خود ایک کھلونا ہے۔ میری رائے میں یہ کھلونے سیاسی کارکنوں میں تقسیم کر دینے چاہئیں جو مخلوط اور جداگانہ انتخابات کے مسائل کو قومی مسئلہ قرار دیتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں اگر یہ قومی اور بنیادی مسائل ہیں تو کیا رہائش۔ خوراک، تعلیم اور روزگار کو سیاسی مسائل کہا جائے گا۔ ہم سے یہ کیوں پوچھا جاتا ہے کہ مخلوط انتخاب چاہتے ہو یا جداگانہ۔ یہ کیوں نہیں پوچھا جاتا کہ تم جہالت چاہتے ہو یا تعلیم، روزگار چاہتے ہو یا بے کاری رہنے کو گھر چاہتے ہو یا فٹ پاتھ۔ فٹ پاتھوں پر گھومنے والا افسانہ نگار

ان دنوں صرف مضامین کے معاوضہ پر اپنی بچیوں کے اسکول کی فیس، بیماریاں اور افسردہ بیوی کا پیٹ پال رہا ہے اور اس نے کلرکی کے لئے جو درخواست دی تھی اس کے جواب میں اس سے پانچ سو روپے کی نقد ضمانت طلب کرلی گئی ہے وہ پانچ سو کے نے بھی نہیں دے سکتا —— کاش اس نے بھی تقدیر اور وزن کا کارڈ نکالنے والی مشین خریدی ہوتی۔ لیکن اس نے مضمون لکھنے کی رفتار تیز کردی ہے۔ دن بھر وہ ریڈنگ روم کی چھت پر بیٹھا ناول لکھتا رہتا ہے اور دن ڈھلے اس کے ذہن میں نئے نئے عنوان ابھرنے لگتے ہیں۔ آج صبح اس نے جاتے ہوئے کہا تھا کہ میں حویلی کابلی مل کے جس بوسیدہ مکان میں رہتا ہوں۔ اس کے مالک نے مجھے مکان خالی کرنے کا نوٹس دے رکھا ہے۔ اس لئے میں ایک "مکتوب حویلی کابلی مل" بھی لکھوں گا۔ جب مکتوب لندن چھپ سکتا ہے تو اسے بھی چھپنا چاہیئے۔

لیکن پیارے اکرام لدھیانوی —— مجھے افسوس ہے کہ خط لمبا ہوتا جا رہا ہے اور ابھی تک میں نے وہ باتیں نہیں لکھیں جو میں لکھنا چاہتا ہوں۔ رات زیادہ ہوتی جا رہی ہے اور لیمپ کی مدہم

روشنی میں مجھے یہ لکھنا ہے کہ اب تک میں گرد و پیش سے بیخبر ہو کر لکھتا رہا ہوں ـــــ اب اس کمرے میں سونے والے سب لوگ واپس آ چکے ہیں۔ میرے ساتھ ٹانگ پر ٹانگ رکھے جو شخص لیٹا ہے اس کی آدھی عمر جیل خانوں میں بسر ہوئی ہے۔ جس زمانے میں انقلاب زندہ باد کہنا جرم تھا انہی دنوں

انگریز مجسٹریٹ نے اس سے سوال کیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"انقلاب"

"تمہارے باپ کا نام کیا ہے؟"

"زندہ باد"۔

یہ سن کر مجسٹریٹ نے اسے ڈیڑھ سال قید کی سزا سنائی اور اسے بچوں کے جیل خانے میں بھیج دیا۔ جب اس کو پہلی بار ہتھکڑی لگائی گئی تو یہ دقت پیش آئی کہ اتنے چھوٹے سائز کی ہتھکڑی ہی نہیں ملتی تھی۔ چنانچہ کلائی کے بجائے کندھے کے قریب کر کے اسے ہتھکڑی لگا دی گئی۔ اسی روز سے اس کا نام انقلاب امرتسری مشہور ہو گیا۔ انقلاب ایک ایسا سیاسی کارکن ہے جسے زینہ بنا کر بہت سے

لوگ اقتدار کی بلندیوں سے ہمکنار ہو گئے۔ لیکن وہ آج بھی انار کلی کے چوک میں کھڑا چار چار آنے والی نعمت اللہ مرحوم کی پیشگوئیاں فروخت کر رہا ہے۔ اس کی محاورہ پرور آنکھیں سیاسی مجاوروں کی بجائے ان گاہکوں کے انتظار میں رہتی ہیں جو پیشگوئیاں خریدتے ہیں پیشگوئیاں بیچنے والے انقلاب نے اپنے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کی اور اب انقلاب اس کمرے کی پھٹی ہوئی دری پر اپنا میلا لحاف اوڑھ کر سو گیا ہے۔ میرے سرہانے کی طرف شوکت صاحب بیٹھے کتابت کے زرد کاغذوں پر کچھ لکھ رہے ہیں۔ شوکت صاحب بیس برس پہلے ریاست حیدر آباد دکن میں گھر والوں سے خفا ہو کر آئے تھے اور پھر واپس نہیں گئے۔ ان کی بود و باش میں سلیقہ اور قرینہ کا بہت دخل ہے۔ وہ ہر کام بہت نفاست سے کرتے ہیں سی لیتے ہیں کہا کرتا ہوں کہ شوکت صاحب آپ بہت نفیس آدمی ہیں۔ وہ بات کرنے سے قبل عموماً مسکرا لیتے ہیں۔ پھر ہنستے ہیں اور یہی عمل بات کرنے کے بعد کرتے ہیں۔ اس پر خفا ہو کر ان کے ایک رقیب نے کہہ دیا تھا کہ شوکت صاحب بات کم کرتے ہیں، اور ہنہناتے زیادہ ہیں۔ اس روز سے انہوں نے اس سے بھی ترک

تعلق کرلیا۔ کھلے پائنچے کا پاجامہ پہنتے ہیں جسے مہینے بھر تک میلا
نہیں ہونے دیتے اور جب میلے کپڑے لانڈری میں دینے جاتے
ہیں۔ اس وقت تک کپڑوں کی استری قائم رہتی ہے۔ ان کا خیال
ہے کہ استری قائم رہنے کی چیز ہے۔ شوکت صاحب جہاں لیٹتے
ہیں پہلے اس جگہ کو جھاڑتے ہیں پھر پونچھتے ہیں اور پھر اس کے
بعد کتابت کے کاغذوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ کاتب ہرگز
نہیں ہیں بلکہ محض کاتب تقدیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایسا کرتے ہیں کیونکہ
گھر چھوڑنے کے بعد وہ "آوارہ و مجنوں" تو بن گئے۔ لیکن "رسوائے بازار
نہیں" ہوئے۔ ایسا کرنے کے لئے انہیں کئی کئی وقت فاقے کرنے
پڑتے ہیں۔ پھر اچانک دیکھا جاتا ہے کہ وہ کسی "عالم فاضل" کے لڑکے
کو ٹیوشن پڑھا رہے ہیں۔ سہرا لکھ رہے ہیں۔ مضمون رقم کر رہے ہیں۔ کتابت
کر رہے ہیں اور جن دنوں وہ کام کر رہے ہوتے ہیں تو صبح اٹھ کر گھنٹوں
شیو بناتے رہتے ہیں۔ غسل خانہ میں چلے جائیں تو پھر تار دے کر
بلانا پڑتا ہے۔ اگر سو جائیں تو ذرا سی آہٹ سے جاگ جاتے ہیں
اس وقت وہ سو چکے ہیں۔ انقلاب خراٹے لے رہا ہے اور میں
تمہارے نام خط لکھ رہا ہوں۔ بازار کا ہنگامہ ختم ہو چکا ہے۔ گھر سے

سناٹے میں کبھی کبھی کتے بھونکنے کی آواز سنائی دیتی ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ مجھے اور کیا لکھنا ہے۔ دراصل یہ بات ہی عجیب سی ہے کہ میں تمہارے نام خط لکھ رہا ہوں تم سے الگ ہو کر۔ مجھے اپنا تصور کرنے میں دقت ہو رہی ہے پھر بھی میں پوچھتا ہوں کہ تم آخر کہاں غائب ہو گئے ہو تم جو ایک مقامی اخبار سے منسلک ہوتے ہوئے ہر روز ایک فیچر لکھا کرتے تھے۔ اب تمہارے قلم کو کیا ہو گیا ہے۔ تمہارے دوست نے تو تین چار فیچر لکھ مارے ہیں اور اس نے کہا تھا کہ میں ایک جنتری خریدوں گا اور ہر اہم دن سے پہلے ایک مضمون لکھ کر بھیج دیا کروں گا۔ تاکہ ایڈیٹر موقع کی چیز سمجھ کر فوراً چھاپ دے اور حکایت معدہ و شکم جاری رہے۔ تم نے بھی تو کہا تھا کہ میں ہونے والے بچے کے نام ایک خط لکھوں گا جس میں لکھا ہو گا —— اے ہونے والے بچے!

"آج رات تمہارے پیدا ہو جانے کا شدید خطرہ ہے اور تمہاری ماں کی زرد آنکھیں ہسپتال کی چھت کو گھور رہی ہیں۔ اول تو میرا مشورہ ہے کہ تم اس دنیا میں آنے کا ارادہ ترک ہی کر دو تو بہتر ہے اور اگر ایسا تمہارے لئے ممکن نہیں تو پھر میں اس خط میں اس گھر اس

شہر اس ملک اور اس دنیا سے تمہارا تعارف کرانا چاہتا ہوں جہاں سب لوگ جھوٹ کو بُرا کہتے ہیں اور سبھی جھوٹ بولتے ہیں کیونکہ جھوٹ میٹھا ہوتا ہے۔ جھوٹ بولنے سے اکثر مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں اور سچ کڑوا ہوتا ہے۔ کڑوی چیز اور کڑوی بات سبھی کو بُری لگتی ہے اور وہی لوگ اچھے ہیں جو کڑوی بات نہیں کرتے۔ میں جانتا ہوں کہ ابھی چند سال تک تم یہ خط نہیں پڑھ سکو گے۔ خط پڑھنے سے پہلے تمہیں زندگی کی کتاب پڑھنی پڑے گی۔ گرمیوں اور سردیوں کی شدت سے مرنے والوں کی داستانیں سننی ہوں گی۔ فاقوں سے نڈھال لوگوں اور کولمبو پلان کا درمیانی فاصلہ معلوم کرتے کرتے تم میری موجودہ عمر کو پہنچ جاؤ گے اور جب تم اس عمر کے ہو جاؤ گے تو تمہیں بھی ایسا خط لکھنے کی ضرورت محسوس ہو سکتی ہے اس وقت تم یہ خط اسی کتاب سے حاصل کر کے پڑھنا اور اس کا جواب آنے والی نسلوں کے لئے چھوڑ جانا۔ کیونکہ واقعات کا چکر کچھ اسی طرح چلتا ہے اور چلتی کا نام صرف گاڑی نہیں چلتی کے ہزار دل نام ہیں۔

میرے پیارے!

اگر تم وہ خط لکھتے تو شاید اس میں یہی کچھ ہوتا یہ خط واقعی بہت

طویل ہو گیا ہے۔ ختم کرنے سے پہلے میں تمہیں آج ہی کا ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں —— شام کو جب میں کافی ہاؤس کے دروازے سے باہر نکلا تو مجھے ایک گداگر کی آواز سن کر بہت تعجب ہوا۔ "ہے کوئی اندھے فقیر کو ایک روپیہ دینے والا؟"

اشیا ضرورت کے چڑھتے ہوئے نرخوں کے سبب اب گداگروں نے بھی اپنے ریٹ میں اضافہ کر دیا ہے

"ہے کوئی اندھے فقیر کو ایک روپیہ —— اور جب میں نے اسے قریب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک آنکھ کھول کر ہر آنے جانے والے کو بھانپ رہا تھا۔ میں نے غصہ سے کہا۔

"تم اندھے بنتے ہو ابھی تو ایک آنکھ سے دیکھ رہے تھے"

"تو پھر اٹھنی ہی دے دو بابا!"

اب تم ہی بتاؤ کہ ہے کوئی جو کانے فقیر کو ایک اٹھنی دلائے

اچھا پیارے۔ اب رات آدھی سے زیادہ گذر چکی ہے۔ میرے سگریٹوں کا پیکیٹ خالی ہو گیا ہے۔ سب لوگ گہری نیند سو چکے ہیں اور صبح نہ جانے کب ہو گی؟

○

روزنامہ "امروز" لاہور
۲۴ ؍ جون ۵۸ء

بور کرنے والے

بور کرنیکے آداب جاننے سے پہلے بور کرنے والوں کی موٹی موٹی اقسام کا جائزہ لینا مناسب ہوگا۔ سب سے پہلی قسم میں لاہور کی برانڈرتھ روڈ کے وہ دکاندار ہیں جن کی دوکانوں پر جلی حروف میں یہ لکھا ہوتا ہے۔

"بور کرنے والے"

بور کرنا دراصل ایک مستقل فن ہے اور ایسے فن کاروں کی وطن عزیز میں کوئی قلّت نہیں۔ صبح سے شام تک بیسیوں آدمی ایسے ملتے ہیں۔ جو اس فن میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ زندگی میں ہر شخص کو ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ جو سارا سارا دن مخلوق خدا کو بور کرنے کا فریضہ سرانجام دیتے پھرتے ہیں۔ اور انہیں کوئی نہ کوئی ایسا مجبور محکوم مل ہی جاتا ہے۔ جو ان کی گفتگو سے بور ہونے پر مجبور ہو جائے

بور کرنا اور بات ہے۔ بور ہونا دوسری چیز ہے۔ میرا خیال ہے کسی سے بور ہو جانا۔ درحقیقت شکست کھانے کے مترادف ہے۔ اور ایسا بھلا آدمی کون ہوگا۔ جو جان بوجھ کر بور ہونے کے لئے آمادہ ہو جائے۔

بور تو وہی ہوتا ہے جو خود کسی کو بور کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ دو آدمی جب آپس میں ملتے ہیں تو وہ عبدالشکوری طور پر معاف کیجئے۔ تحت الشعوری طور پر ایک دوسرے کو بور کرنے کی مسلسل کوشش کرنے لگتے ہیں۔ یہاں دونوں کی صلاحیتیں آپس میں آمادۂ پیکار ہو کر ایک کو فتح اور دوسرے کو شکست دے دیتی ہیں۔ فتح مند کہتا ہے وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ شکست خوردہ اسے بور کے خطاب سے نوازتا ہے۔ بور کرنے کے آداب جاننے سے پہلے بور کرنے والوں کی موٹی موٹی اقسام کا جائزہ لے لینا غیر ضروری نہ ہوگا۔

سب سے پہلی قسم میں تو لاہور کی برانڈرتھ روڈ کے اُن دوکانداروں کا نام آتا ہے۔ جن کی دکانوں پر جلی حروف میں لکھا ہوتا ہے۔

"بور کرنے والے"

لیکن یہ لوگ انسانوں کی بجائے موٹر کے پرزوں کو بور کرنے کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں اور مجھے اعتراف کر لینا چاہیئے کہ میں اس سلسلہ میں بالکل کچھ نہیں جانتا کہ موٹر کے پرزے کب موڈ میں

ہوتے ہیں اور انہیں کس وقت بور کرانے کی ضرورت پیش آتی ہے مجھے کبھی کسی "موٹر کے پرزے" سے اس موضوع پر بات چیت کرنے کا اتفاق بھی نہیں ہوا۔ میں نے صرف گوشت پوست کے انسانوں تک ہی اپنی تحقیقات کو محدود رکھا ہے۔ اس لئے صرف انسانوں کی بات کروں گا۔

مجھے یہ کہہ دینے میں کوئی تامل نہیں کہ بور کرنے والے تمام حضرات ایک منظم گروہ کی صورت میں اللہ کی مخلوق کو فائدہ پہنچاتے رہیں۔ ان لوگوں نے تقسیم کار کے لحاظ سے الگ الگ شعبے مقرر کر رکھے ہیں۔ پہلے شعبے کے اراکین عموماً اخباروں کے دفتروں میں چکر لگاتے رہتے ہیں۔ اگر آپ بدقسمتی سے صحافی تھے یا آج کل بھی ہیں تو ایسے لوگوں سے یقیناً آپ کو سابقہ پڑا ہوگا۔ جو بور کرنے والوں کے مذکورہ شعبے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کو میں بور کرنے والوں کی پہلی قسم میں شمار کرتا ہوں۔

میرے دفتر میں ایک صاحب بلاناغہ تشریف لاتے ہیں لیکن ان کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ کیونکہ موت اور بور کن کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ بہرکیف، وہ جب بھی آتے

ہیں۔ یہی فرماتے ہیں کہ :۔

"سناؤ بھائی کیا حال ہے"۔

"اچھا ہوں آپ سنائیے"۔

یہ کہہ کر خاکسار قلم رکھ کر سراپا نیاز ہو جاتا ہے، اور وہ میز پر رکھے ہوئے اخبارات کی ورق گردانی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ انہیں مصروف دیکھ کر میں پھر اپنے کام میں لگ جاتا ہوں۔ اتنی دیر میں وہ پھر توجہ فرماتے ہیں :۔

"اچھا اور سنائیے کیا حال ہے؟"

"جی اللہ کا احسان ہے۔ آپ سنائیں"۔

اور وہ کچھ سنانے کی بجائے پھر اخبار پڑھنے لگتے ہیں۔ اور ہر دس منٹ کے بعد ایک فرمائشی قہقہہ لگا کر پوچھ لیتے ہیں۔

"اور سنائیے کیا حال ہے"۔

اور جب میں یہ فقرہ سنتے سنتے "اوورحال" ہو جاتا ہوں۔ تو وہ یہ کہتے ہوئے تشریف لے جاتے ہیں کہ

"معاف کیجئے آپ کا بہت وقت ضائع کیا اور سنائیے کیا ــــــ"

ایک دوسرے صاحب اپنے بلند پایہ اشعار سمیت تشریف لاتے ہیں۔ اور ہمیشہ تین چار غزلیں ازراہِ عنایت عطا فرماجاتے ہیں اور اس کے بعد ہر روز یہی پوچھتے ہیں کہ

"وہ غزلیں کب شائع ہوں گی؟"

صرف اتنی بات پوچھنے کے لئے وہ باغبانپورہ سے ایک طویل مسافت طے کرنے کے بعد یہاں آتے ہیں اور ایسے آتے ہیں کہ پھر نہیں جاتے اور اگر چلے بھی جائیں تو اپنی تشریف آوری کے ایسے گہرے اور دیرپا نقوش چھوڑ جاتے ہیں کہ پھر گھنٹوں کوئی کام کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

راقم الحروف فقیر پر تقصیر اور شاید ہونے والا صفیر یعنی آپ کا یہ خادم اکرام لدھیانوی کسی کے اس شعر کی زندہ تفسیر بن کر رہ جاتا ہے۔ ؎

کس قدر بور ہو گئے ہیں ہم
ہور سے ہور ہو گئے ہیں ہم

بعض کرم فرما سال بھر میں صرف چند مرتبہ بور کرنے کے ارادے سے نازل ہوتے ہیں۔ ورنہ عموماً وہ بھلے آدمی کے روپ ہی میں

ملتے ہیں۔ اپنے ایک ایسے ہی کرم فرما گزشتہ روز دفتر میں آئے اور آتے ہی کہنے لگے صرف پندرہ منٹ کے لئے میرے ساتھ چلو۔ اس طرح وہ مجھے اپنی خوبصورت کار میں بٹھا کر بازارِ حسن لے گئے۔ اور وہاں پہنچ کر انکشاف کیا کہ کسی سماجی تقریب میں ناچنے گانے والی لڑکیوں کی ضرورت پیش آگئی ہے، دو گھنٹے تک ناچنے والی کی تلاش جاری رہی۔ آخر دن ڈھلے واپس پہنچنے کی نوبت آئی۔ اس اثنا میں مقبرہ جہانگیر بھی جانا پڑا جس کے دروازے پر لکھا ہے کہ:-

"دربار غ میں گانا بجانا منع ہے۔"

حالانکہ اندر گانا بھی ہوتا ہے اور بجانا بھی۔

بور کرنے والوں کی ایک ٹولی ہوٹلوں میں بھی پائی جاتی ہے اس کے سرکردہ اراکین کافی ہاؤس کی مخلوق کو اپنی مشق کا نشانہ بناتے ہیں۔ اس ٹولی کے چار ممبر ہیں اور چاروں اپنے اپنے شعبہ سے متعلق لوگوں میں بور کرنے کے فن کی تبلیغ کرتے ہیں۔ پہلے ان کی تفصیل سن لیجئے:-

سیاسی بور کرنے والے۔

ادبی بور کرنے والے

صحافی بور کرنے والے
ہر فن مولا یعنی آل راؤنڈرز

سیاسی بور من

عموماً سیاسی میڈروں کے گرد منڈلاتے ہیں اور مسئلہ سویز سے شہزادی مارگریٹ کے معاشقے تک تمام حالات سے مکمل واقفیت رکھتے ہیں۔

پاسنگ شو کے سگریٹ پیتے ہیں کافی میں شکر نہیں ملاتے اور باتیں کرتے ہوئے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پوچھتے رہتے ہیں۔

"آپ بور تو نہیں ہو رہے"
اور جب تک آپ تسلیم نہ کریں کہ میں بور ہو گیا ہوں۔ وہ اپنی تقریر جاری رکھیں گے۔

ادبی بور من

انہیں ولی دکنی سے احمد راہی تک کے اشعار زبانی یاد ہوتے

ہیں۔ منشی پریم چند سے میرزا ادیب تک جتنے نثر نگار رہیں سب کے چیدہ چیدہ افکار پر دسترس ہوتی ہے۔ جب ملتے ہیں موازنہ انیس و دبیر اور حدائق البلاغت کے حوالوں سے گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔ کسی ادبی جماعت کی تنظیم اور اردو کی بقاء کے لئے تجاویز زیر بحث لاتے ہیں۔ پاکستان کے ادیبوں کی زبوں حالی کا رونا روتے ہوئے آپ کے پیکٹ سے آخری سگریٹ تک نکال کر پھونک ڈالتے ہیں۔ اور اس وقت تک تشریف نہیں لے جاتے جب تک آپ خود نہ چلے جائیں۔

صحافی لور کن

صحافی حضرات اپنے معاشقوں کا ذکر بھی اخباری زبان میں کرتے ہیں۔ راہ چلتے اگر کوئی خوبصورت لڑکی مل جائے تو کہیں گے

"اسے دیکھ کر میرے دل کی کاپی اڑ گئی ہے"۔

صحافی اور لیڈر کو بھوک لگتی ہے تو وہ کہتا ہے:۔

"قوم بھوکی ہے"۔

اسے نیند آ رہی ہو تو وہ اپنی بجائے قوم کا نام لے کر کہے گا۔

"قوم سو رہی ہے۔"

ایسے لوگ جب دوسرے صحافیوں سے ملنے جاتے ہیں تو بال بچوں کا حال پوچھنے کی بجائے پوچھتے ہیں۔

"سناؤ تمہارے ضمیمے کس حال میں ہیں۔"

"کیا کسی نئے ضمیمے کی تیاری ہے؟"

"نہیں یار اپنے ہاں تو لیس سٹاپ پریس ہوگیا ہے۔"

ہر فن مولا

ہر فن مولا قسم کے بور کن حضرات کی فہرست میں سر فہرست میرا نام آتا ہے اس لئے اس سلسلہ میں کچھ عرض کرنے کی بجائے یہ مشورہ دوں گا کہ آپ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد بھی اگر بور نہیں ہوئے تو مجھ سے ملنے کی کوشش کریں اور خود اندازہ لگائیں کہ بندہ کسی کو بور کرنے کے لئے کون کون سے ذرائع اختیار کرتا ہے اور ان ذرائع کی ایک فہرست بنا کر مجھے بھیج دیجئے۔ تاکہ آئندہ قسط لکھتے ہوئے میرے کام

○

روزنامہ "آزاد" لاہور
یکم دسمبر ۵۶ء

ہوٹلوں کا شہر

شام کے وقت شبزان کے گداز صوفوں پر بین الاقوامی کھجوریں بیٹھتی ہیں اور اپنے آشناؤں کی چائے میں شکر ملاتی ہیں اور جو لوگ آسمان سے گرتے ہیں وہ سیدھے ان کھجوروں میں آ کر اٹک جاتے ہیں۔

لاہور کی معاشرت میں ہوٹلوں اور ریستورانوں کا باب خارج کردیا جائے تو وہی حال ہوگا جو اختر شیرانی مرحوم کے کلام سے، سلمٰی اور عذرا کے نام خارج کردینے سے ہوسکتا ہے لاہور کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالنا تاریخ دانوں کا کام ہے۔ مجھے تو یہاں کی تہذیب و تمدن معیشت اور معاشرت کے ان گوشوں پر نظر ڈالنا ہے۔ جن کا تعلق ہوٹلوں اور ریسٹورانوں سے ہے لاہور کے جن گلی کوچوں میں جائیے ایک آدھ ریستوران ضرور ملے گا۔ ہر ریستوران کے الگ الگ آداب اور فضا ہے۔ یہ شہر جو چھوٹے چھوٹے قہوہ خانوں سے عالیشان ہوٹلوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اس پر مفصل لکھنے کی گنجائش نہیں۔ مزید تمہید سے گریز کرتے ہوئے اصل موضوع کی

طرف آتا ہوں۔

لاہور کے ہوٹلوں میں سب سے زیادہ نمایاں مقام مال روڈ کے ہوٹلوں کا ہے۔ مال روڈ پر کم وبیش چھوٹے بڑے سولہ ریستوران ہیں۔ ان میں ایڈلفی، فلیٹیز اور نیسنڈوز ذرا خاندانی قسم کے ہوٹل ہیں۔ دوسرے درجہ پر شیزان میٹرو کے سی نو اور میرینا کا نام لیا جا سکتا ہے۔ تیسری صف میں اسٹینڈرڈ کیفے اور ری انٹا اور چائنیز کو رکھ لیجئے۔ کافی ہاؤس اور پاک ٹی ہاؤس وغیرہ کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ اس لئے انہیں اس درجہ بندی میں شامل نہیں کرنا چاہیئے۔ سیاسی افواہوں کے لئے کافی ہاؤس اور ادبی انجمن سازی کے لئے پاک ٹی ہاؤس کی فضا بہت موزوں قرار پائی ہے۔ شیزان ایک ریسٹوران ہے جو گرمیوں میں ٹھنڈک اور سردیوں میں گرمی پہنچاتا ہے۔ آجکل سردی کے دن ہیں اور شیزان میں مختلف قسم کے ہیٹر ملتے ہیں۔ یوں کہہ لیجئے کہ سردیوں میں گرمی حاصل کرنے کے لئے مختلف ذرائع استعمال کئے جاتے ہیں۔ ان دنوں جب کہ سورج ڈوبتے ہی ہر طرف دھند اور کہر پھیل جاتی ہے تو شیزان کے سرخ صوفوں پر بیٹھنے والی "بیکنی کلر مخلوق" گرمی کا کچھ حصہ ان نوٹوں

سے حاصل کرتی ہے۔ جو ان کی جیبوں میں پڑے رہتے ہیں۔ آجکل
لوگوں کو زیادہ سے زیادہ گرمی کی ضرورت درپیش رہتی ہے میں نے
اس حصولِ حدّت کے مختلف ذرائع دریافت کئے ہیں۔ چند ایک
آپ بھی سُن لیں۔

کافی

چائے

مرغن غذائیں

ہیٹر

ان کے علاوہ سیاسی گٹھ جوڑ اور سازشیں بھی حصول حدّت
میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ زود اثر
ذریعہ غراروں اور اچکنوں کی باہم ملاقاتوں سے تعلق رکھتا ہے۔
اس سلسلہ میں کچھ ایسی باتیں آتی ہیں جو کبھی سنی یا لکھی نہیں جا سکتیں۔
بلکہ صرف دیکھی اور محسوس کی جا سکتی ہیں۔

گرمیوں کے موسم میں جب لاہور کی سڑکیں سلگتے ہوئے
ریگستان بن جاتی ہیں۔ تب ان صحراؤں میں کسی چشمہ کے
کنارے کھجور کے درختوں کا ایک جھنڈ دکھائی دیتا ہے

اس نخلستان کا نام شیزان ہوٹل ہے۔ شام کے وقت شیزان ہوٹل کے سُرخ صوفوں پہ بین الاقوامی کھجوریں بیٹھتی ہیں اور اپنے آشناؤں کی چائے میں شکر ملاتی ہیں اور جو لوگ آسمان سے گرتے ہیں وہ سیدھے ان کھجوروں میں آ کر اٹک جاتے ہیں۔

آسمان سے گرنے والے کافی ہاؤس کی پراسرار گیلری میں بھی نازل ہوتے ہیں اور وہاں گہری سبز میزوں پر جُھک کر ان لڑکیوں کے خوبصورت چہروں پر سگریٹ کا دھواں پھیلاتے ہیں۔ جو گھر سے کالج جاتی ہیں اور راستے میں ارادہ بدل کر کافی ہاؤس پہنچ جاتی ہیں۔ اس ضمن میں ایک محترمہ کی بات سُن لیجئے۔ خاتون اپنے مرحوم باپ کو سیشن جج بتایا کرتی ہے جو گورداسپور کے ضلع میں نائب تحصیلدار تھا۔ کافی ہاؤس میں وہ اپنے ایک منہ بولے بھائی جان سے ملنے آیا کرتی تھی۔ اور اپنے سرخ پرس میں کالج کے لڑکوں کے رومانی خط رکھا کرتی تھی۔ اسی پرس میں ایک ڈائری بھی تھی مصنوعی قہقہے اگلتی تھی۔ فلائنگ ساسر کھایا کرتی تھی اور اُڑایا کرتی تھی۔ فلائنگ ساسر اڑن طشتری کو کہتے ہیں اور کافی ہاؤس میں ایک کھانے کی چیز کا نام فلائنگ ساسر ہے۔

خاتون کافی ہاؤس کی گیلری میں ایک مخصوص کردار ہونے کی حیثیت سے مشہور رہے کالج سے نکلنے کے بعد اس نے لاہور میں تین چار معرکے کے رومان لڑ لئے اور اپنی آنکھوں کے گرد حلقے ڈال لئے۔

پچھلے دنوں اخباروں میں ایک خبر شائع ہوئی تھی کہ کافی ہاؤس کے قریب خاتون نامی ایک لڑکی نیم بے ہوشی کی حالت میں پائی گئی۔ تحقیقات پر معلوم ہوا کہ وہ ایک ہفتہ وار اخبار کے دفتر سے مٹھائی کھا کر آئی تھی اور وہاں آ کر اچانک بیہوش ہو گئی۔

یہ تو روحانی بیہوشی کا ذکر تھا۔ کافی ہاؤس کی مخلوق کو اکثر و بیشتر سیاسی۔ ادبی اقتصادی اور خدا جانے کس کس قسم کی بیہوشی کے دورے پڑتے ہیں۔ کافی سے بھاپ اٹھتی ہے اور قدآور شیشوں کے اس پار مال روڈ کی چمکیلی سڑک پر لوگ کسی ان جانی منزل کی طرف آتے جاتے رہتے ہیں۔

○

روزنامہ "آزاد" لاہور

۲۹ نومبر ۵۶ء

لیڈرومینیا

لیڈرومینیا ایک عالمگیر مرض ہے۔ جو مہذب ممالک کی جنگی طاقتوں کے علاوہ کسی لیڈر کے شبستان کی طرح دن کو دوگنی امدرات کے وقت چارگنی ترقی کر رہا ہے۔

سب سے پہلے تو یہ مان لینا چاہیئے کہ "لیڈرومینیا" ایک عالمگیر مرض ہے۔ جو "مہذب ممالک" کی جنگی طاقتوں کے علاوہ کسی لیڈر کے شبستان کی طرح دن کو — دوگنی — اور — رات کے وقت چارگنی ترقی کر رہا ہے۔

اب سنیئے کہ میں نے بڑی تحقیق کے بعد یہ معلوم کیا ہے کہ جن دنوں انسان نے تہذیب نہیں سیکھی تھی یعنی جب انسان "اٹیم بم" اور سپوتنک "سے واقف نہیں ہوا تھا۔ اس زمانے میں انسان "لیڈرومینیا" تو کیا "لیڈر" کے معنی بھی نہیں جانتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ انسان کو خطوط کی اہمیت کا پتہ چلنے لگا۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ احساسِ ملکیت اور انفرادی ذخیرہ اندوزی کی "شاندار تحریکیں" زور پکڑنے لگیں۔ اور

انسان اپنے ہی بھائی بندوں کو غلام بنا کر ان سے نامہ بر کا کام لینے لگا۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ حضرت انسان، کمزور انسانوں تو کیا پرندوں تک سے یہ کام لینے سے نہیں چوکتے۔ اسی زمانے کا ذکر ہے جب کسی بلند پایہ شاعر نے کسی شہزادی یا بیگم کے لئے یہ مایۂ ناز گیت کہا تھا۔ ع

"اے نامہ بر کبوتر انگلینڈ جا کے کہنا"

پھر کبوتر انسان کے پنجے سے نکل گیا اور وہ کمزور انسان کو انگلینڈ بھیجنے لگیں۔ یعنی کبوتر تو اڑ گیا۔ اور طبقاتی تقسیم جیسے بے نظیر اصولوں نے کمزور انسان کو طاقتور انسان کے چنگل میں پھنسا دیا۔

بہرحال مجھے تو اپنا ذکر کرنا ہے۔ سو پیاری خواتین و حضرات انسانیت کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ کبوتر کے اڑ جانے کے بعد طاقتور انسان نے کمزور کو اس خدمت پر معمور کر دیا اور وہ بیچارہ کمزور انسان آج تک گلے میں تھیلہ ڈالے اس موذی مرض "لیٹر و مینیا" کو گھر گھر تقسیم کرتا پھر رہا ہے۔

ممکن ہے آپ سمجھیں کہ میں نے یہ باتیں یونہی یعنی بات برائے بات کی ہیں۔ مگر آپ یقین کیجئے کہ میں "بات برائے حیات" کا قائل ہوں اور

کبھی کبھی تو "بات برائے انقلاب" کا بھی قائل ہو جاتا ہوں۔

خیر سنیے۔ یوں تو یہ بیماری خطوط کے ساتھ ہی عالم وجود میں آ گئی تھی۔ اور اوّل اوّل آپس میں عشق کرنے والے قارئین —— معاف کیجئے میرا مطلب ہے "خواتین و حضرات" میں اس مرض کو فروغ ہوا پھر رفتہ رفتہ —— تجارت خانوں —— جیل خانوں —— دوا خانوں —— زنان خانوں —— سفارت خانوں —— اور یہاں تک کہ باورچی خانوں تک کے لوگ اس میں مبتلا ہو گئے۔ "لیٹرومینیا" کے مریض کی تشخیص کچھ اتنی دشوار نہیں۔ مثلاً آپ اپنے کسی دوست کو اکثر غالبؔ اقبالؔ۔ حالیؔ۔ شبلیؔ۔ عطیہ فیضی قسم کے بزرگوں کے خطوط کا ذکر کرتے سنیں۔ اور بحث کے دوران میں بھی وہ مذکورہ دوست، کچھ اس قسم کی گفتگو کرتے ہوں۔

"واہ صاحب، اقبال بڑا آدمی تھا۔ کیا خوب! ذرا ان کے وہ خطوط تو دیکھو جو انہوں نے فلاں نواب صاحب کو لکھے تھے"

"اماں! غالبؔ کی شخصیت دیکھنی ہو تو اردوئے معلٰی پڑھو۔ اے سبحان اللہ کیا بے ساختگی ہے ان خطوط میں"۔

"بچوں کو تربیت دینا ہو تو۔ ڈپٹی نذیر احمد کے خطوط پڑھواؤ

جو انہوں نے بشیر کے نام لکھے تھے ——" تو بس سمجھ جائیے کہ یہ آپ کے دوست صاحب جن کا نام ہم نے "کسی" تجویز کیا ہے۔ "ہسٹوریکل لیٹرومینیا" یعنی تاریخی لیٹرومینیا" کے مریض ہیں۔

اب ایک واقعہ سناتا ہوں شملہ میں میری ایک دوست تھیں جو ہمیشہ سنگار میز پر بیٹھ کر خط لکھا کرتی تھیں۔ ان کی سنگار میز کی دراز میں "رائٹنگ پیڈ" اور لفافوں وغیرہ کے ساتھ ایک عدد "ایوننگ ان پیرس" سینٹ کی شیشی بھی دھری رہتی تھی۔ میں بہت دنوں تک سوچتا رہا کہ یہ کیا راز ہے۔ سنگار میز اور خط و کتابت کا سامان —— آخر ان کا کیا جوڑ ہے؟ ایک عرصہ یونہی سوچتے سوچتے گزر گیا۔ کہ ایک روز انہوں نے ایک خط جیب سے نکالا! سنگار میز کے قریب گئیں۔ اور اس پر سینٹ لگا کر پھر جیب میں رکھ لیا۔ بس وہ راز کھل گیا اور مجھے فوراً پتہ چل گیا۔ کہ محترمہ کو "لیٹرومینیا آف رومانس یعنی رومانی لیٹرومینیا" کی شکایت ہے ——!

ممکن ہے آپ پوچھیں۔ کہ میں نے وہ خط کبھی پہلے کیوں نہ دیکھا۔ اور اسی روز کیوں دیکھا۔ اوّل تو آپ یہ بات پوچھیں گے ہی نہیں اور اگر آپ پوچھ ہی بیٹھیں تو میں بتا دوں گا کہ "لیڈی فرینڈ"

قسم کی لڑکیوں کی ــــ پرائیویٹ پاکٹ گریبان کے اندر کسی جگہ ہوتی ہے اور آپ جانیے کسی کے گریبان میں جھانکنے سے پہلے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھ لینا چاہیئے۔ لیٹر و مینیا کی تیسری قسم، تجارتی لیٹر و مینیا ہے۔ اس کے مریض عموماً۔ امپورٹ۔ ایکسپورٹ دفتر شادی ــــ خفیہ لٹریچر اور ایکٹروں کی ضرورت" کے لمبے لمبے اشتہار دیا کرتے ہیں۔ ان کے تجارتی ادارے کافی مشہور ہوتے ہیں۔ لیکن آپ اندازہ کیجئے کہ زمانہ کس قدر ترقی کر گیا ہے۔ کہ وقت اور فاصلہ کے ساتھ ساتھ ایک مشہور و معروف "فرم" بھی سمٹ سمٹا کر ڈیڑھ ہاتھ کے پوسٹ بکس میں تہہ ہو جاتی ہے ایسے مریض عموماً پوسٹ آفس کے گرد منڈلاتے پائے جاتے ہیں۔

میں چونکہ ایسی ایسی تمام بیماریوں کا لاثانی معالج ہوں۔ اس لئے میں نے اپنے تجربات کی بنا پر لیٹر و مینیا کے مریضوں کی تشخیص کے لئے چند اصول وضع کئے ہیں۔

جب کوئی لمبے لمبے بالوں والا نوجوان چھٹی رساں کی طرف حسرت سے دیکھے تو سمجھ جائیے کہ وہ لیٹر و مینیا کا مریض ہے۔ یہ شخص یا تو ایکٹر ہو گا۔ یا شاعر یا مصور یا ادیب ہو گا۔ یا کچھ اور ہو گا۔

جب کوئی لڑکی۔ خواب گاہ کے دروازے بند کر کے رات گئے تک بتی نہ بجھائے اور پوچھنے پر مطالعہ یا بے خوابی کا بہانہ کر دیا کرے تو اسے میرے پیارے قارئین! سمجھ جائیے کہ وہ لڑکی یقیناً لیٹرومینیا کی مریض ہے اور جب دروازے بند کرتی ہے تو صرف خط لکھتی ہے۔ خط ہی پڑھتی ہے دوسری صورت میں خط پڑھنے یا لکھنے کے ارادے باندھتی ہے۔ سوچتی ہے —— اور پھر توڑ دیتی ہے کہ کہیں کچھ "ایسا ویسا" نہ ہو جائے۔

جب کوئی طالب علم اپنی جیب میں کاغذوں کی گڈیاں رکھنا شروع کر دے اور نئی نئی قسم کے پین خریدنے لگے اور ہمیشہ پڑھنے پر بھی امتحان میں فیل ہو جائے تو جان لیجئے کہ وہ جب کہتا ہے کہ "میں خوب پڑھتا ہوں" تو اس فقرے میں خوب سے پہلے لفظ "خط" چھپا لیتا ہے۔ اور "لیٹرومینیا" کا مریض ہے ——

کوئی نوجوان عورت پوسٹ آفس کے سامنے والے منشی جی کے سامنے بیٹھی اپنے بچے کے منہ میں سوکھی ہوئی چھاتی بھی ٹھونستی جائے اور خط بھی لکھواتی جائے تو سمجھ لیجئے۔ یہ اپنے خاوند کے نام خط لکھوا رہی ہے۔ یہ میاں بیوی دونوں لیٹرومینیا کے مریض

ہوں گے۔ اور خطوط کے ذریعہ "ریڈ کلف" لائن کو پھاندنے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔

میرے دوستوں میں جن کو "لیٹرومینیا" کی شکایت ہے انہوں نے بڑی محنت اور جانفشانی کے بعد اس کے لئے چند وجوہات گھڑ رکھی ہیں۔ مختصر یہ کہ اس ایک مرض نے کسی کو تو فائدہ پہنچایا۔ اور وہ فائدہ یہ ہے کہ وہ اچھے خاصے انسان سے انٹلکچوئل بن کر رہ گئے۔

قمر تسکین کو کیونکہ شدید قسم کا لیٹرومینیا ہے۔ اس لئے میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کے پاس دس روپیہ ہوں تو ساڑھے آٹھ روپے کے ٹکٹ اور ڈیڑھ روپیہ کے سگریٹ خریدتا ہے۔ سگریٹ اس لئے کہ وہ قلم کی بجائے سگریٹوں سے خط لکھنے کا عادی ہے وہ ہمیشہ بڑے ڈاکخانہ میں جا کر خط پوسٹ کرتا ہے۔ اگر اس کا بس چلے تو وہ مکتوب الیہ کے گھر جا کر خط دے آیا کرے۔ اس کے پاس پیسے نہ ہوں تو وہ خطوط نما لفافہ لکھ کر مکتوب الیہ کو آگاہ کر دیتا ہے

شبلی بی کام کا لیٹرومینیا سب سے عجیب ہے۔ شبلی دراصل بڑے شکی مزاج کا آدمی ہے۔ اسے کوئی لڑکی خط لکھے تو سمجھتا ہے کہ لڑکے کا خط ہے۔ کوئی لڑکا لکھے تو اسے یقین ہوتا ہے کہ یہ

خط کسی لڑکی کا ہے۔ اس لئے وہ ایک مدت سے خط لکھتا ہی نہیں۔ مگر میری رائے میں وہ پھر بھی "لیٹرومینیا" کا مریض ہے۔ کیونکہ اپنی ایڈیٹری کے دوران میں اسے بہت سے خطوط لکھنے پڑتے ہیں۔ جو خطوط برائے اقتصادیات کی زندہ تصویر ہوتے ہیں۔

اب سنیئے ابراہیم جلیس کا قصہ۔ جلیس یوں تو لیٹرومینیا کا مریض نہیں پھر بھی جانے کیوں اُسے یہ محسوس کرنے میں مسرت ہوتی ہے کہ وہ بہت خط لکھتا ہے۔ برسوں کی بات ہے۔ میں کراچی میں تھا جلیس سے ملنے گیا۔ تو دیکھا کہ وہ ایک خط کو ہاتھ میں لئے دریائے حسرت و یاس میں غوطہ زن ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا ہے (کیونکہ ابراہیم جلیس سے پوچھنے ہی پر معلوم ہوا کرتا ہے) کہ وہ خط کسی صاحبزادی کا ہے اور جلیس اس لئے پریشان تھا کہ اب کیا ہوگا۔ میں نے تسلی دی کہ بھیّا "وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا"۔ تم خط لکھتے چلو۔

نہیں "اخرام بھائی" وہ اکرام کو اخرام کہتا ہے) میں تو خط لکھے جاؤں مگر مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ لڑکی مجھ سے شادی نہ کر لے بات واقعی بڑی سیریس تھی۔ بہت دیر تک غور و خوض کرنے کے بعد اس نے خود ہی ایک ترکیب ڈھونڈھ نکالی اور مجھے بتا دیا کہ

"میں اسے اپنی تصویریں بھیج دوں گا۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

تو میرے قارئین! ان مثالوں سے ثابت ہوا کہ قمر تسکین کو لیٹرومینیا کا مرض اس لئے ہے کہ وہ کتاب مرتب کرنا چاہتا ہے ——— شبلی بی کام اقتصادیات سے مجبور ہو کر خط لکھتا ہے ——— ابراہیم جلیس کو ——— جلیس کو بھی یہ عارضہ ہے مگر اس کی وجہ میں اب تک نہیں سمجھ سکا۔ اور میں لیٹرومینیا کا مریض اس لئے ہوں کہ مجھے طرح طرح کے سلام جمع کرنے کا شوق ہے۔ اب تک میں نے جتنے قسم کے سلام جمع کئے ہیں۔ ان میں سے چند آپ بھی سُن لیں ——— محبت کا سلام ——— جسے عرفِ عام میں سلام محبت کہتے ہیں اور فلم ایکٹریس ترنم سے اس کا مطلب پوچھا کرتی ہیں ——— سلامِ محبت کا مطلب بتا دو۔

خلوص کا سلام ——— جسے فارسی میں سلام خلوص کہتے ہیں اور لکھنے والا کبھی مخلص نہیں ہوتا ——— عقیدت کا سلام ——— جس کا لاطینی زبان میں ترجمہ "سلام چاپلوسی" ہے۔ یہ سلام بچے بزرگوں کو اور ہونے والے داماد، نہ ہونے والے خسر کو کیا کرتے ہیں۔"

مچھلی شہر کا سلام — جو مچھلی شہر میں پیدا ہوا۔ اور نظموں کے ساتھ افسانے بھی لکھتا ہے۔ اس سلام کو ادیبوں کی زبان میں سلام مچھلی شہری کہتے ہیں۔

باقی کے سلام آپ مجھ سے خط لکھ کر پوچھ سکتے ہیں"

اس تحقیق کے دوران میں بہت سے عبرتناک حادثے دیکھنے میں آتے ہیں اور ایسے صاحبو! ایسا ہی ایک حادثہ اس بندۂ ناچیز کے ساتھ بھی پیش آیا۔ میں ایک ماہنامہ مرتب کیا کرتا تھا اور میری نظر کمزور تھی۔ میں نے ایک اشتہاری دواخانہ سے — سرمہ عینک توڑ منگوایا۔ انہوں نے سرمہ تو بھیج دیا۔ مگر ترکیب استعمال نہ بھیجی۔ میں نے فوراً جلال میں آکر ایک عدد خط لکھ مارا کہ "پرچہ ترکیب استعمال بھیجئے" ابھی یہ خط لکھ ہی رہا تھا کہ مجھے اپنی ہونے والی محبوبہ کا خط ملا ہونے والی اس لئے کہ ان دنوں میں زبردستی اُسے محبوبہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہاں تو یہ دونوں خطوط میں نے دو مختلف لفافوں میں ڈال کر بھیج دیئے۔ چوتھے دن اُن صاحبہ کا خط ملا کہ "تم انتہائی گھٹیا

آدمی ہو۔ میں ان عورتوں میں سے ہرگز نہیں ہوں۔ جو تمہاری "بٹر فلائیوں" کی طرح پرچۂ ترکیب استعمال اپنے ساتھ رکھتی ہیں — خیریت چاہتے ہو تو۔ آیندہ مجھے کبھی خط نہ لکھنا۔

○

ماہنامہ "نقاد" کراچی
دسمبر ۱۹۵۱ء

جو لوگ کچھ نہیں کرتے

فنکاروں کے لئے ضروری نہیں کہ وہ کاریں بنانے کا فن بھی جانتے ہوں۔ البتہ ایسے لوگ کبھی کبھی کاروں کی دلالی میں منہ کالا ضرور کر لیتے ہیں۔

وہ جو کسی نے کہا ہے کہ ع

جو لوگ کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں

تو بات یہ ہے کہ کمال کرنے والے عموماً اپنے تئیں فن کار کہلاتے ہیں اور فن کاروں کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ کاریں بنانے کا فن بھی جانتے ہوں۔ البتہ ایسے لوگ کبھی کبھی کاروں کی دلالی میں منہ کالا ضرور کر لیتے ہیں۔ بظاہر یہ لوگ کچھ نہیں کرتے لیکن تجربہ شاہد ہے کہ پس پردہ بہت کچھ کر گذرتے ہیں۔ اور اپنی بے کاری ختم کر کے اچانک نئے ماڈل کی کاریں بھی خرید لیتے ہیں۔

یہ بات الگ ہے کہ بے کار آدمی بہت کارآمد ہوتے ہیں اور کسی برسر روزگار سے زیادہ مصروف رہتے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ کسی

شاعر کے اس مصرعے پر سختی سے عمل پیرا ہوا کرتے ہیں کہ ع

بے کار مباش کچھ کیا کر!

ابھی ابھی میں نے فن کاروں کو اہل کمال کہا تھا جن کی ایک بہت بڑی اکثریت کے بارے میں کسی شاعر نے بڑے کام کی بات کہی ہے کہ ؎

یوں پھریں آشفتہ حال اہل کمال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

اہل کمال کا ذکر کرنے سے پہلے میں زوال دہلوی کی بات کروں گا۔ زوال صاحب کمال کے آدمی ہیں اور بات بات پر کمال کرتے ہیں۔ انہوں نے پہلا کمال یہ کیا کہ عثمانیہ یونیورسٹی سے بھاگ گئے، دوسرا کمال یہ کیا کہ پاکستان تشریف لے آئے۔ تیسرا کمال یہ ہے کہ آتے ہی پاکستان میں کیڑے نکالنے شروع کر دیئے۔ یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ موصوف کیڑے مکوڑوں کی نفسیات سے کمال تک واقف ہیں۔ البتہ وہ خود ایک چلتے پھرتے کیڑے مکوڑے ضرور ہیں پاکستان میں پہنچتے ہی انہوں نے مسمریزم کی پریکٹس شروع کر دی۔ اسی لئے وہ اپنے حلقۂ احباب میں پروفیسر کے نام سے مشہور ہیں۔ پروفیسر

زوال دہلوی کو اگر راستے میں ٹھوکر لگ جائے تو انہیں پورے پاکستان پر جلال آجاتا ہے۔ اور وہ خفا ہو کر کہتے ہیں۔

"پاکستان کیا بنا ہے لوگوں کے لئے بوچڑ خانہ ہے چاہے کوئی ٹھوکر کھا کر مرجائے اتنا نہیں ہوتا کہ سڑک سے کنکر اٹھا دیئے جائیں۔ اسی طرح ایک روز کسی ہوٹل والے نے انہیں ادھار کھانا کھلانے سے انکار کر دیا تو فرمانے لگے۔ واہ رے پاکستان شریف آدمیوں کا اعتبار ہی اُٹھ گیا ہے کسی بھلے آدمی کی زبان پر بھروسہ تک نہیں کر سکتے، لوگوں کی آنکھوں کا پانی مرگیا ہے جی پاکستان جو ٹھہرا۔"

ایک رات زوال صاحب بس سٹاپ پر کھڑے تقریر کر رہے تھے کہ آخری بس آگئی۔ اس میں پہلے ہی بہت بھیڑ تھی کہ اس پر چند آدمی اور بھی سوار ہو گئے جب زوال صاحب داخل ہوئے بس کھچا کھچ بھر چکی تھی چنانچہ حسبِ عادت ارشاد ہوا کہ :۔

"بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ مسافروں کو بیٹھنے کی جگہ نہ ملے۔ پاکستان کیا بنا ہے بس والوں نے مسافروں کو ٹرک میں سامان کی طرح لادنا شروع کر دیا ہے۔"

یہاں اس بات سے بحث نہیں کہ پروفیسر صاحب خود بھی

پاکستان ہی میں رہتے ہیں۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ قصور چاہے اپنا ہو انہیں پاکستان ہی پر الزام دھرنے میں مزا آتا ہے۔ گزشتہ رات وہ میرے ساتھ سینما دیکھنے گئے۔ پکچر شروع ہوتے ہی انہیں سگریٹ کی طلب ہوئی۔ میں نے لاکھ سمجھایا کہ سینما ہال میں سگریٹ پینا منع ہے لیکن وہ کب ماننے والے تھے۔ فوراً سگریٹ نکالا اور اسے دیا سلائی دکھا دی، ہال میں اندھیرا تھا ماچس کے شعلے کی روشنی سے پولیس کے سپاہی کو اپنا فرض یاد آیا اور اس نے پروفیسر صاحب کا سگریٹ ضائع کرا دیا، وہ اس وقت تو خاموش رہے جب سپاہی چلا گیا تو کہنے لگے:-

"پاکستان بننے کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ لوگ کسی تفریحی مقام پر سگریٹ بھی نہ پئیں، دھوئیں کا اتنا ہی ڈر ہے تو ایسے سینما ہال بنائیں جہاں سے گندی ہوا فوراً خارج ہو جایا کرے لیکن اتنی تکلیف کون کرتا ہے جی پاکستان میں"۔

خیر اس قصے کو چھوڑیئے، شروع میں ذکر کیا گیا تھا کہ جو لوگ کچھ نہیں کرتے وہ بھی کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں، ممکن ہے آپ سوال کر بیٹھیں کہ کچھ نہ کچھ سے میری کیا مراد ہے اول تو آپ یہ سوال ہی کیوں

کرنے لگے اور اگر آپ نے پوچھ ہی لیا تو میں فوراً بتا دوں گا جو لوگ کچھ نہیں کرتے وہ یہ سات کام کرتے ہیں۔

(۱) اشتہاری دوا فروشی (۲) دفتر شادی (۳) ڈگری فروشی (۴) چندہ خوری (۵) ایکٹروں کی بھرتی (۶) مقدر کا حال بتانا (۷) وہ کوئی ساتواں کام بھی یقیناً کرتے ہیں جو ان سے پوچھنے پر معلوم ہو سکتا ہے۔

یوں تو جو لوگ کچھ نہیں کرتے وہ مسمریزم بھی کرتے ہیں۔ بلیک بھی کرتے ہیں سمگلنگ بھی کر لیتے ہیں لیکن جن پیشوں کا اوپر ذکر ہو چکا ہے وہ انہیں بہت مرغوب ہیں۔ البتہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو سوائے کمال کے اور کچھ نہیں کرتے۔ میرا خیال ہے کہ سب سے پہلے خالص کمال کرنے والوں کا تذکرہ کیا جائے

ایک اہل کمال نے بھری محفل میں اعلان کیا کہ مجھے ایک ایسی ترکیب معلوم ہے جس کے ذریعے آپ ہر اُس شخص سے دس روپے وصول کر سکتے ہیں۔ جس کے پاس دس یا اس سے زیادہ روپے موجود ہوں جو کوئی یہ لاجواب ترکیب جاننا چاہے اسے مبلغ دس روپے بطور فیس ادا کرنے ہوں گے۔ ترکیب غلط ثابت ہونے پر فیس واپس۔ یہ سن کر اس کے ایک واقف نے جیب میں ہاتھ ڈالا

اور جھکتے ہوئے دس کا نوٹ اسے دے کر پوچھا۔

"یہ لو اپنی فیس اور بتاؤ ایسی کیا ترکیب ہے"۔

اس نے نوٹ اپنی جیب میں رکھ کر مسکراتے ہوئے اس کے کان میں جواب دیا کہ:۔

"بس یہی ترکیب ہے کہ جس طرح میں نے تم سے دس روپے لئے ہیں بالکل اسی طرح تم بھی لوگوں سے لے لیا کرو"۔

اب ایک اور واقعہ سنیئے۔ رات کے وقت دو اہل کمال کسی حلوائی کی دکان پر گئے ایک پیچھے کھڑا رہا، دوسرے نے آگے جاکر ایک سو روپے کا نوٹ نکالا جو ایک کونے سے پھٹا ہوا تھا۔ اس نے نوٹ دوکاندار کو دے کر اس سے سیر بھر مٹھائی خریدی، باقی روپے لئے اور چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسرا ساتھی آیا اس نے بھی سیر بھر مٹھائی مانگی مٹھائی دینے کے بعد دوکاندار نے دام طلب کئے تو کہنے لگا میں نے تمہیں سو کا نوٹ دیا ہے۔ باقی روپے نکالو، بات بڑھ گئی لوگ باگ جمع ہونے لگے تو اہل کمال نے واویلا مچایا کہ دیکھتے صاحب کیسا دوکاندار ہے نوٹ لے کر مکر گیا ہے دوکاندار نے کہا۔ "یہ جھوٹ بولتا ہے" اس نے جواب دیا۔ "میرے

پاس ثبوت ہے"۔ لوگوں کے پوچھنے پر اس نے کہا کہ اس کی تلاشی لے کر دیکھ لو۔ میرا نوٹ ایک کونے سے پھٹا ہوا تھا، اہل کمال نے نوٹ کا نمبر بھی بتا دیا۔ جب تلاشی لی گئی تو نوٹ برآمد ہو گیا۔ لوگوں نے دوکاندار کو شرمندہ کیا اور اہل کمال اپنا نوٹ لے کر یہ کہتے ہوئے دوسرے ساتھی سے چل ملا کہ :۔

"لاؤ میرا نوٹ میں تمہارے جیسے فریبی دوکاندار سے سودا نہیں خریدتا"

اب سنئے کہ برسوں پہلے میں کراچی میں تھا"گے لارڈز ہوٹل" کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک شخص اچانک مجھ سے لپٹ گیا۔

"ارے اختر کے بچے کہاں تھا تو"۔

میں نے کہا "معاف کیجئے میرا نام اختر نہیں فیصل ہے" وہ بیچارا شرمندہ سا ہو کر کہنے لگا۔ "آپ کچھ خیال نہ کریں میرا ایک بھائی اختر گھر سے غائب ہے کئی سال سے اسے تلاش کر رہا ہوں، ہو بہو آپ ہی سی شکل و صورت تھی اس کا لب و لہجہ بھی آپ سا تھا۔ بلکہ مجھے تو شک ہے کہ تم ہی اختر ہو اور اب مجھے خواہ مخواہ بنا رہے ہو"۔

میں نے اسے یقین دلایا کہ تم غلطی پر ہو۔ یہ سن کر اس کی آنکھیں

بھر آئیں اور اس نے بڑے دردناک لہجے میں التجا کی کہ میں اس کے ساتھ "ہوٹل گے لارڈ" میں کچھ وقت گزاروں مجھ سے انکار نہ ہو سکا اور میں اس کے ساتھ ہوٹل میں داخل ہو گیا ہلکے بسنتی رنگ کی میز پر جھکتے ہوئے اس نے میری طرف بلیک اینڈ وائٹ کے سگریٹوں کا ٹن بڑھایا جس میں بمشکل تین چار سگریٹ تھے۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا۔ پھر اس نے بیرا کو ڈنر کا آرڈر دیا اس کے بعد سویٹ ڈش اور میرے انکار کے باوجود مجھے زبردستی کھلاتا رہا۔ اس کے بعد "میں ابھی حاضر ہوتا ہوں" کہہ کر چلا گیا، اور جب وہ دو گھنٹے تک حاضر نہ ہوا تو میرے حواس غائب ہو گئے میں نے سگریٹ کا ٹن کھول کر دیکھا، اس میں ایک سگریٹ اور ایک رقعہ تھا کہ :-

"میرے اجنبی دوست!

میں شام کا کھانا عموماً پردیسیوں سے کھایا کرتا ہوں۔ اُمید ہے آپ میرے کمال کی داد دینے کے بعد بل بھی دے دیں گے۔"

سوائے میرے پیارے قارئین!

اب تک تو آپ ان لوگوں کا ذکر سن رہے تھے جو صرف کمال کرتے ہیں، آیئے اب ذرا ان سے بھی مل لیں جن کے درپردہ

پیشوں کا ذکر سرسری طور پر ہو چکا ہے۔

اشتہاری دوافروشی

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا چلے ہیں اور اب ان جگہ اشتہارات کے ذریعہ دوائیں فروخت کرنے والوں نے سنبھال لی ہے۔ یہ لوگ بھی بظاہر کچھ نہیں کرتے اور اکثر ڈاکخانہ کے گرد منڈلاتے ہوئے پائے جاتے ہیں، ان کی ادویات کے جہازی اشتہار دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے پاس بہت بڑا دواخانہ ہوگا لیکن

اتنے بڑے دواخانہ کو ڈاک خانہ کے پوسٹ بکس میں بند کر لینے والے لوگ جو اشتہار دیتے ہیں اس میں ہر مرض کے شرطیہ علاج کا اعلان ہوتا ہے اور اشتہار کے آخر میں عموماً یہ نوٹ درج ہوتا ہے کہ یہ دوا حاملہ عورتیں ہرگز استعمال نہ کریں کیونکہ اس سے حمل ضائع ہو جاتا ہے۔ اب یہ انکشاف دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ عموماً حاملہ عورتیں ہی یہ دوا منگاتی ہیں۔

دفترِ شادی

کچھ نہ کرنے والے لوگوں کا پیشہ دفتر شادی قائم کرنا بھی ہوتا ہے یہ دفتر بھی ڈاکخانہ کے پوسٹ بکس میں بند رہتا ہے اور دفتر کے کرتا دھرتا صرف، اتنا کرتے ہیں کہ اخبار میں ضرورت رشتہ کا اشتہار دے چھوڑتے ہیں جس میں نوجوان کنواری لکھی پڑھی اور بیوہ عورتوں کے علاوہ برسرِ روزگار کنوارے رنڈوے اور شریف لڑکوں کے لئے رشتے کی ضرورت کا اعلان ہوتا ہے۔ لڑکے کی آمدنی عموماً پانچ سو روپئے ماہوار سے زائد ہوتی ہے۔ وہ صاحبِ جائداد بھی ہوتا ہے اور جملہ خط و کتابت صیغۂ راز میں رکھی جاتی ہے اور یہ بات بڑے راز کی ہے کہ انہیں روزانہ بہت سے منی آرڈر موصول ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ راز و نیاز کی کمائی کھاتے ہیں۔

ڈگری فروشی

"اگر آپ بے روزگاری کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں تو مفت میں ڈاکٹر بن کر اپنے متعلقین کے علاوہ ملک و ملت کی خدمت کیجئے داخلہ شروع ہے۔ پراسپکٹس دو روپے کے ٹکٹ بھیج کر مفت طلب کریں۔

اس مضمون کا اشتہار بھی وہی لوگ دیا کرتے ہیں جن کے بارے میں عام خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کچھ نہیں کرتے حالانکہ وہ ڈاکٹری کرتے ہیں سرٹیفیکیٹ چھپواتے ہیں کالج کھولتے ہیں اور بغیر تعلیم بغیر امتحان ڈگری فروخت کر کے ملک و ملت کو نئے نئے ڈاکٹروں سے مالا مال کرتے ہیں۔

چندہ خوری

یوں تو یہ پیشہ قومی کارکنوں اور یتیم خانوں کے نگران حضرات کو بہت مرغوب ہے۔ گم شدہ بچوں کی تلاش اور مسجد کی تعمیر کے دلکش نعروں کے طفیل یہ دھندہ برسوں سے مقبول عام ہے لیکن راقم الحروف "کا پیشہ بھی برسوں یہی رہا ہے اس لئے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ چندہ لینا ایک مستقل فن ہے جس کے لئے کافی تجربہ مشاہدہ اور قوت ارادی کے علاوہ قیافہ شناسی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک زمانہ میں مجھے اتنی مہارت تھی کہ میں کسی شخص کو دیکھتے ہی بتا سکتا تھا کہ اس سے کتنا چندہ مل سکتا ہے۔ اور یہ کہ آیا یہ شخص چندہ دے گا بھی کہ نہیں۔ ابھی دنوں کی بات ہے مجھے کئی روز سے چندہ دستیاب نہیں ہو رہا تھا کئی جلسوں کے اعلان کئے بہت سے پوسٹر شائع

گئے لیکن سب بے سود۔ میں اسی فکر میں مگن اپنے محبوب ہوٹل کی ایک میز پر جھکا بیٹھا تھا کہ اچانک میری نگاہ کونے کی میز پر پڑی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک باریش بزرگ عبا قبا، جبہ اور عصا سے آراستہ ہو کر بیٹھے ہیں۔ میرے قیافہ نے اس کی پریشانی کو بھانپ کر بتایا کہ یہ شخص اس وقت چندہ دینے کے موڈ میں ہے۔ چنانچہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر یوں بات چلائی کہ "اے فرشتہ صورت بزرگ کیا میں آپ کا اسم گرامی معلوم کرنے کی سعادت حاصل کر سکتا ہوں؟" اس نے میری بات سنی، پہلے ہنسا پھر بھی ہنسا اور کہنے لگا میں شیخ سعدی ہوں اور اس وقت گلستان بوستاں کی رائلٹی وصول کرنے کے بعد یہاں چائے پینے آیا ہوں۔

"اے شیخ سعدی آپ خوش قسمت ہیں جو اپنی کتابوں کی رائلٹی وصول کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اگر میں غلط نہیں تو آپ اس وقت چندہ دینے کے موڈ میں ہیں اور غالباً آپ پریشان بھی اسی لئے ہیں۔"

میری بات سن کر انہوں نے اپنے پہلو میں بیٹھی ہوئی ایرانی بلی کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

"نوجوان ہم تمہاری ذہانت اور قیافہ شناسی سے خوش ہوئے بتاؤ تمہاری کیا خدمت کی جائے۔"

میں نے چندہ کی درخواست کی جسے انہوں نے یہ کہتے ہوئے ٹھکرا دیا کہ ہم نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ اگر کتابوں کی رائلٹی مل گئی تو آدھی رقم چندہ پسند مقررین کو دے دیں گے۔ اب یہ فیصلہ ناقابل تنسیخ ہے"۔ تب میں نے عرض کیا کہ ع

"سعدیا شیراز یا چندہ مدہ کمذاورا"

یہ سن کر ایرانی بلی خفا ہو کر ہوٹل سے باہر نکل گئی اور نہ بھی اس کے تعاقب میں سیڑھیاں اُتر گئے۔

ایکٹروں کی بھرتی

یہ پیشہ بھی انہی لوگوں میں مقبول ہے جو بظاہر کچھ نہیں کرتے اور پس پردہ سکرین کے پردہ پر نظر آنے والی مخلوق کی مقبولیت سے فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن یہ پردہ کی بات ہے اور پردہ آجکل ان نوجوانوں کی عقل پر پڑ گیا ہے جو اداکار بننے کے شوق میں اپنے گھروں سے روپیہ لے کر بھاگ جاتے ہیں اور اداکاری کے چکر میں آکر وہ دن دیکھتے ہیں جب فاقوں سے چکرا کر گرنا پڑتا ہے۔

○

مکتوب اندھیر نگری

اندھیر نگری کے راجہ کو چوپٹ کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ اس لئے لوگ اسے چوپٹ راجہ کے نام سے یاد کرتے تھے۔ چوپٹ راجہ نے اپنی رعایا کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کا ہر منصوبہ چوپٹ کر دیا تھا۔

اندھیر نگری اس ریاست کا حقیقی نام تو نہیں لیکن جب ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا تو بعض لوگ اسے اندھیر نگری کہنے لگے تھے یہ ان دنوں کی بات ہے جب اندھیر نگری کا ذکر کرتے ہوئے مجھے روشن دین کا خیال بہت ستایا کرتا تھا۔

روشن دین کے تنگ و تاریک گھر میں ایک بھی روشن دان نہ تھا۔ چنانچہ اس کا خاندان برسوں صحت اور روشنی سے محروم رہا۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس کے گھر کی طرح اس کے دماغ پر بھی تاریکیاں مسلط ہو چکی تھیں۔ روشن دین ہرگز اتنا روشن دماغ نہیں تھا کہ کسی سیاسی جماعت کا لیڈر بن کر اپنے اندھیرے گھر میں اُجالا کر لیتا در حقیقت روشنی کے اس زمانہ میں وہی شخص روشن دماغ کہلانے کا مستحق سمجھا جاتا تھا

جس نے دنیا بھر کے چراغ بجھا کر اپنے گھر میں روشنی سمیٹ لی ہو، اور روشن دین بیچارے کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں تو یوں بھی اجالوں سے خوف کھاتی تھیں۔ اس کی آنکھیں اجالوں سے خوف کھاتی تھیں اور اس کا دل زندگی سے خوف کھاتا تھا۔ سچ پوچھئے تو اسے خوف کھانے کی اتنی عادت ہوگئی تھی کہ وہ اکثر اوقات روٹی کی جگہ بھی خوف ہی کھا لیا کرتا تھا!

خوف جہالت کی پیداوار ہے۔ جہالت اندھیرے کو کہتے ہیں۔ اور اندھیرا اس ریاست میں عام پایا جاتا تھا۔ یہ ریاست جو اندھیر نگری کے نام سے مشہور تھی اس کے راجہ کو چوپٹ کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ اس لئے لوگ اسے چوپٹ راجہ کہتے تھے۔ اندھیر نگری کا چوپٹ راجہ چوپٹ کے فن میں اتنا ماہر تھا کہ اس نے اپنی رعایا کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کا ہر منصوبہ چوپٹ کر دیا تھا۔

وہ بہت بے نیاز قسم کا راجہ تھا اور اپنے ان نیازمندوں پر بہت مہربان تھا جو ایک زمانہ تک قوم کے مزار پر نیازیں کھاتے رہے تھے یہ باتیں بڑے راز و نیاز کی ہیں اور ایسی باتیں ماضی میں وہی لوگ جرأت سے کر سکتے تھے جنہیں اکثر و بیشتر چوپٹ راجہ کے نیاز حاصل ہوا

کرتے تھے۔ ان لوگوں کو چوپٹ راجہ کی ناز برداری بھی کرنا پڑتی تھی اور
ہمیں تو کوئی بار برداری کے لئے بھی موزوں نہیں سمجھتا تھا۔ اس لئے
ہم اگر ان رموزِ سلطنت کا سراغ لگانے کی کوشش کرتے تو ممکن ہے
ہمیں یہ سودا بہت مہنگا پڑتا۔ یوں تو مہنگائی کے اس زمانہ میں اندھیر
نگری کی رعایا کو بھی سودے مہنگے پڑتے تھے اور وہ لوگ سودائی
کہلاتے تھے جو مہنگائی کا رونا رویا کرتے تھے۔ پھر آپ جانئے
رونا دھونا تو یوں بھی کم ہمت اور زندگی سے بھاگے ہوئے لوگوں کا
شیوہ ہے۔ اور زندگی جو ہے تو محض زندہ دلی کا نام ہے۔ اندھیر نگری
کے راجہ کی طرح اس کے درباری بھی بہت زندہ دل تھے اور دلوں
کی سوداگری کیا کرتے تھے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ انہیں ہر معاملہ میں
سودا بازی پر اتر آنے کی عادت کیوں ہو گئی تھی مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ
انہیں خاص طور پر سیاسی سودا بازی اتنی مرغوب کیوں تھی۔ جب کہ
ان کے لئے بیان بازی، ہیر بازی اور ہر قسم کی بازیاں موجود تھیں
لیکن وہ لوگ سیاست کے میدان میں قلابازی کھانے کے بہت شوقین تھے
روشن دین غریب غم کھاتا رہتا تھا اور اس کے نمائندے سیاسی قلابازیاں
کھاتے رہتے تھے ٹھیک ہے جسے جو میسر ہو وہی کھا لیتا ہے!

اندھیر نگری کے معززین کھانے پینے کے بہت رسیا تھے، اور کوئی کام کھائے پئے بغیر نہیں کرتے تھے۔ ان کے علاوہ اس نگری میں ہر میدان کے کھلاڑی پائے جاتے تھے جن میں چوپٹ باز، نوسر باز کبوتر باز اور ہر قسم کے باز بہ افراط ملتے تھے لیکن وہ باز جن کی بلند پروازی کے افسانے مشہور ہیں ان کی جگہ گدھ براجمان تھے گدھ مردار خور ہوتا ہے اسے پرندوں کا ہلال خور بھی کہتے ہیں شاید اسی وجہ سے اندھیر نگری کے کسی گدھ کو حرام خور کہنے کی اجازت نہیں تھی اور اگر کوئی اس گستاخی کی جرأت کر بیٹھتا تو اسے ہاتھ پاؤں باندھ کر چوپٹ راجہ کے حضور میں پیش کر دیا جاتا تھا۔ چوپٹ راجہ ایسے معاملات کا فیصلہ کرنے میں اپنے درباریوں سے مشورہ کرنا ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ درباری لوگ یوں بھی راگ رنگ میں اتنے مصروف ہوا کرتے تھے کہ انہیں ایسی باتوں میں دخل دینے کی فرصت نہیں تھی۔ درباری لوگ، راگ رنگ کے بہت شوقین تھے اور راگ درباری ان کا پسندیدہ راگ تھا۔ انگریزوں کے زمانہ میں انہیں میاں کی ٹوڈی بہت پسند تھی سب مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ میاں اور ٹوڈی میں کیا رشتہ ہے۔ البتہ میں یہ جانتا ہوں میاں کی ٹوڈی پسند کرنے والے عموماً میاں صاحب کہلاتے تھے اور معزز

درباریوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جو شخص اپنے سالے بہنوئی قسم کے عزیزوں کو ٹھیکے دلانے کی صلاحیت رکھتا ہوتا سے درباریوں میں شامل کر لیا جاتا تھا۔ کیونکہ ٹھیکہ وہی ہوتا ہے جو ٹھیک وقت پر لگے

میں اس وقت کی بات کروں گا جب اندھیر نگری کی مختلف سیاسی پارٹیاں عوام کے نام پر اپنے مفادات کی جنگ، لڑ رہی تھیں۔ ان دنوں اس ریاست میں تقریروں نعروں اور جلسے جلوسوں کا بازار بہت گرم تھا۔ اس گرم بازاری میں لیڈروں کے دل سرد ہو گئے تھے اور فاقہ کش عوام حسرت سے چوپٹ راجہ کے محل کی طرف دیکھ رہے تھے جس کے دروازے پر حقوق داخلہ محفوظ کی تختی لگی رہتی تھی۔

جاننے والے جانتے تھے کہ اندھیر نگری میں آئے دن پیدا ہونے والی لیگیں محض برائے نام ہیں حقیقی لیگیں صرف دو تھیں جن میں ایک کا نام لائسنس لیگ تھا اور دوسری کو پرمٹ لیگ کہا جا سکتا ہے ان لیگوں کے کرتا دھرتا وہی لوگ ہوا کرتے تھے جو ہر لحاظ سے کار آمد ہوں۔ کیونکہ کاروں کی آمد اس زمانہ میں بہت زور شور سے ہوا کرتی تھی۔ روشن دین کے جسم میں نہ تو زور تھا نہ شور مچانے کا حوصلہ اس لئے وہ ہمیشہ بے کار ہی رہا کرتا تھا۔

روشن دین نے اپنی بیکاری دور کرنے کیلئے کئی بار ایسے لوگوں سے مدد چاہی جن کے پاس نئی نویلی کاریں تھیں لیکن وہ لوگ صرف انہی لوگوں کی مدد کیا کرتے تھے جو ان کے لئے کار آمد ہوں اور اب چونکہ "کار رفت" کا زمانہ آگیا ہے۔ چنانچہ روشن دین ان کے چہرے پر ہوائیاں اُڑتی دیکھ کر مارے خوشی کے ہوا میں اڑا جاتا ہے۔ اگرچہ ابھی اتنا وقت نہیں گزرا کہ اس کی تاریک کوٹھڑی میں تازہ ہواؤں کا گزر ہونے لگے، اور اس کے بیمار پھول کے چہروں پر صبح کے سورج کی سنہری کرنیں رقص کرنے لگیں۔ لیکن روشن دین کی نامراد آنکھوں میں اُمید کی روشنی جھلکنے لگی ہے۔ آج اسے رہ رہ کر اس سیاسی لیڈر کا خیال آرہا ہے جو ریشمیں شیروانی پہن کر لباس کی سادگی پر تقریریں کیا کرتا تھا۔ اس رہنما نے ایک بار تو جوش میں آکر اپنے ننگے بھوکے عوام کو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ع

"تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس"

یوں تو وہ عریانی کا بہت دلدادہ تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے پہلو میں دل ہی نہ تھا۔ اور وہ جو اس کے کشادہ سینہ میں دھڑکتا تھا تو وہ دل نہیں بلکہ کسی امریکی کلاک کا پنڈولم تھا کہ جس کا نہیں ہوتا۔

روشن دین اب تو روزگار سے لگ گیا ہے لیکن اسے وہ زمانہ نہیں

بھوتا جب وہ دردر کی ٹھوکریں کھایا کرتا تھا کیونکہ اس کے پاس اپنے کنبہ کے علاوہ صاحب لوگوں کو کھلانے کے لئے کچھ نہ تھا۔ انہی دنوں کسی نے اسے مشورہ دیا کہ تم لاہور سے ہندوستانی نوٹ لے کر کراچی چلے جاؤ واپسی پر ان کا سونا لیتے آنا ایک چکر میں پانچ چھ سو روپے مل جایا کریں گے۔ روشن دین جیل جانے سے تو نہیں ڈرتا تھا۔ اکیلا ہوتا تو شاید مان بھی جاتا لیکن بیوی بچوں کا خیال کر کے اس نے یہ پیشکش ٹھکرا دی۔ اس کے ہمدرد نے کہا "یہ بھلائی کا زمانہ ہی نہیں ہم تو تمہارے بھلے کی کہتے تھے نہیں مانتے تو جاؤ بھوکوں مرو"۔۔۔۔ بات اگر بھوکوں مرنے پر ختم ہو جاتی تو بھی ٹھیک تھا لیکن اسے تو بھوکوں جینا پڑتا تھا کیونکہ اس کے حصہ کا اناج مذکورہ ہمدرد کے بھائی بندوں نے ذخیرہ کر رکھا تھا ذخیرہ اندوزوں کی طرف سے چشم پوشی کرنا چوپٹ راجہ کے درباریوں کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی اور جی سچی بات تو یہ ہے کہ وہ خود ہی ذخیرہ اندوزی کیا کرتے تھے۔ یوں کرنے کو تو وہ لوگ سمگلنگ بھی کر لیتے تھے لیکن زیادہ تر وہ سمگلروں کی پشت پناہی کر کے اپنی پشتوں کے لئے روٹی کپڑے کے علاوہ ان کے سر پر مقبروں کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ کسے معلوم تھا کہ راتوں رات کیا ہو جائے گا اور انہیں یہ دن بھی دیکھنا نصیب ہو گا کہ

روشن دین جیسا مدقوق اور فاقہ کش ان پر قہقہے لگا رہا ہے۔

سرکاری درباری لوگوں کے طفیل یہاں ایک اور طبقہ بھی بہت فروغ پا رہا تھا۔ وہ لوگ بلیک اینڈ وائٹ کے سگریٹ پیا کرتے تھے اور بلیک مارکیٹ میں اضافہ کے لئے جدوجہد کیا کرتے تھے۔ بلیک مارکیٹ کا یہ عالم تھا کہ سارے بازار سیاہ ہو گئے تھے۔ سیاسی اور اندھیرے کی مناسبت سے میرا بہت جی چاہتا تھا کہ اس ریاست کو صاف الفاظ میں اندھیر نگری کہہ دوں۔ لیکن وہ زمانہ صفائی کا نہیں تھا اسی لئے میں صاف بات کرنے سے گریزاں رہا۔ ان دنوں تو ہر طرف گندگی جھوٹ ملاوٹ اور جعل سازی کا سکہ چلتا تھا۔ روشن دین کی طرح میری جیب بھی ہمیشہ ان سکوں سے خالی رہا کرتی تھی اس لئے ہم دونوں کا شمار بے روزگاروں اور بیکاروں میں کیا جاتا تھا۔ کار تو اب بھی ہمیں نہیں ملی پھر بھی شکر ہے کہ وہ زمانہ لد گیا جب لوگ کہتے تھے کہ ع

"کار والا تیری قدرت کا تماشا دیکھے"

اب تو تماشا دیکھنے والے خود ہی تماشا بن گئے ہیں۔ اور اپنی تماش بینی کے دن یاد کر کے آنسو بہا رہے ہیں۔ اچھے تماش بین تو ایسے تھے کہ راتیں کوٹھوں پر بسر کرتے اور دن کوٹھیوں میں گزارتے

تھے۔ یہ لوگ اشیارِ خورد و نوش میں ملاوٹ کرنے کا معزز پیشہ کرتے تھے۔ پھر بھی پیشہ ور نہیں کہلاتے تھے۔ ملاوٹ کا رواج اتنا عام ہو گیا تھا، کہ گھی کی جگہ موبل آئل اور مرچوں کی جگہ پسی ہوئی سرخ اینٹیں تو ایک معمولی بات بن کر رہ گئی تھی۔ اشیائے ضرورت تو رہیں ایک طرف ان دنوں خالص آدمی بھی مشکل ہی سے ملتے تھے۔ ملاقاتوں میں ملاحتی اور مصنوعی گرم جوشی روزانہ کا معمول بن کر رہ گئی تھی مصنوعی چیزوں کا ایک سبب تو یہ تھا کہ وہ زمانہ مصنوعات کی افزائش کا تھا یہ اور بات ہے اکثر مصنوعات غیر ملکی اور سمگل کی ہوئی ہوتی تھیں۔

اس زمانہ میں جن "ملکی صنعتوں" نے فروغ پایا، ان میں امدادی کمپنیاں، معمہ کمپنیاں اور بوگس فلموں کی صنعتیں خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں، ان دنوں لوگوں کو ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی راتوں رات امیر بننے کا بہت جنون ہو گیا تھا۔ آخر یہ جنون رنگ لایا اور اب ایسے سب لوگوں کی رنگت زرد پڑ گئی ہے جو زردہ پلاؤ کے علاوہ کچھ کھانا اپنی کسرِ شان سمجھتے تھے اب یہ شاندار لوگ بڑی شان و شوکت سے جیل کے فلک بوس دروازے کی طرف جا رہے ہیں۔ اور عوام ان کے شایانِ شان استقبال کرنے کی مصیبت سے نجات پا گئے ہیں۔

اس نجات کا قصہ بھی بہت ڈرامائی ہے لیکن یہ ڈرامہ تو ابھی چند روز پہلے کھیلا گیا ہے۔ اسے دہرانے سے کیا فائدہ؟ اب تو صرف اتنا جان لینا ہی کافی ہے کہ چوپٹ راجہ آخرکار خود بھی چوپٹ ہو گئے اور اندھیر نگری کا منحوس نام وطن عزیز کی پیشانی سے ڈھل گیا۔ اب اندھیرا چھٹنے لگا ہے اور

صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بیتاب ٹھہر

○

بیسویں صدی دہلی

مئی ۵۹ء

ہونے والی بیوی کے نام

میرے غریب خانے کی چھتوں پر جنگلی کبوتروں نے "آلنے" بنا رکھے ہیں۔ اس لئے تم چاہو تو اسے کبوتر خانہ بھی کہہ سکتی ہو۔ میری طرح میرے غریب خانہ کی حالت بھی بہت خراب ہے۔ اس لئے میڈم ڈرو اس وقت سے جب دونوں کا خانہ خراب ہو جائے گا۔

یہ خط تمہارے ہاں بن بلائے مہمان کی طرح آٹپکا ہے اور تم حیران ہو کہ یہ خط آخر کس کے نام ہے۔

آؤ میں تمہاری حیرانی کو دور کیئے دیتا ہوں۔ سب سے پہلے تم یہ جاننا چاہو گی کہ یہ خط کس کا ہے۔ اس کے جواب میں اگر کہوں کہ تمہارے ہونے والے خاوند کا تو شائد تم بُرا مان جاؤ گی۔ میں اعتراف کر لینا چاہتا ہوں کہ میں نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔ مجھے تمہارا نام بھی نہیں معلوم۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ تمہارے والد صاحب کون ہیں تمہارے کتنے بھائی بہن ہیں۔ اور تم کہاں رہتی ہو؟ تم پڑھتی ہو یا تعلیم سے فارغ ہو چکی ہو۔ لکھی پڑھی اور ماڈرن لڑکی ہو یا بالکل جاہل اور گنوار۔ ان میں سے کسی سوال کا جواب بھی میرے پاس نہیں۔ مجھے بالکل نہیں معلوم کہ تمہاری

آنکھیں کیسی ہیں آوارہ ہرنیوں کی سی یا میری طرح چھوٹی چھوٹی اور مرجھائی ہوئی۔ جن پر عینک کا نیلگوں غلاف چڑھا رہتا ہے تمہاری قامت کسی مصور کے خیال کی طرح بلند ہے یا میری طرح پستہ۔ تمہارا جسم سنبل کے تکیہ کی طرح گداز اور سڈول ہے یا میری طرح ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ لیکن اس طرح تو تم اور بھی حیران ہو رہی ہوگی۔ سوال یہ ہے کہ جب میں نے کبھی تمہارا ذکر بھی نہیں سنا تو پھر میں تمہارے نام خط لکھنے کیوں بیٹھ گیا ہوں۔ جواب یہ ہے کہ میرے ہاتھ میں شادی کی لکیر بہت گہری ہے اور مجھے کسی نجومی نے بتایا تھا کہ تمہاری شادی اٹھائیس برس کی عمر میں ضرور ہو جائے گی۔ مجھے نجومی کی بات پر یقین ہے اور اب میری عمر بھی اٹھائیس برس ہوگئی ہے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ جب میری شادی ہونا ہی ہے تو ظاہر ہے کسی لڑکی سے ہوگی اور وہ لڑکی مجھ سے اٹھائیس سال ہرگز چھوٹی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تم اس دنیا میں آچکی ہو اور فی الحال اپنے والدین کے ہاں پرورش پا رہی ہو ایک روز ایسا بھی آئے گا جب تم دلہن بن بیٹھو گی اور میں شادی کے تحفے میں تمہیں وہ راشن کارڈ دوں گا جس پر کئی کئی ہفتہ راشن کا اندراج نہیں ہوتا راشن کا خانہ خالی دیکھ کر مجھے اپنے غریب خانے کا خیال آجاتا ہے جو

سب کچھ ہے لیکن دولت خانہ ہرگز نہیں اس کی چھتوں پر جنگلی کبوتروں نے "آلنے" بنا رکھے ہیں۔ اس لئے تم چاہو تو اُسے کبوتر خانہ بھی کہہ سکتی ہو میری طرح میرے غریب خانے کی حالت ہی بہت خراب ہے۔ اس لئے میڈم ڈرو اس وقت سے جب تم اچانک میری بیوی بنا دی جاؤ گی۔ اور ہم دونوں کا خانہ خراب ہو جائے گا۔

ہماری شادی کن حالات میں ہو گی۔ اس سلسلہ میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے تمہارے بوڑھے باپ کو اگر وہ بقید حیات ہے میں نے بقید حیات اس لئے لکھا ہے کہ جوان لڑکیوں کے باپ عموماً حیات کی قید ہی میں ہوتے ہیں اور بہت جلد بوڑھے ہو جاتے ہیں ممکن ہے اسے میرے جیسے لڑکے کی تلاش ہو اور کسی دن بجالیات کے دفتر میں ہم دونوں کے والدین کی ملاقات ہو جائے اس طرح وہ ہم دونوں کے بیاہ کا فیصلہ کر لیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم میری کسی تحریر سے متاثر ہو کر مجھ سے ملاقات کا وقت مانگو اور اس طرح ہم جلد از جلد عشق و عاشقی کے تمام مراحل طے کر کے اپنے اپنے گھروں سے بھاگ نکلیں لیکن اگر ایسا ہوا تو بہت برا ہو گا کیونکہ اپنے چھوٹے چھوٹے گھروں سے نکل کر پھر ہمیں بڑے ہی گھر میں پناہ لے گی اور پولیس ہم دونوں کو آہنی زیورات پہنا دے گی اور ہماری بارات

میں باوردی سپاہی شامل ہوں گے۔ اس طرح جب ہماری غیر قانونی شادی کی خبریں اخباروں میں چھپیں گی تو میرے حواس کی کاپی اڑ جائے گی۔ یہ تصور کتنا اندوہناک ہے ہماری شادی ہونے کا ایک طریقہ یہ بھی ممکن ہے کہ میں حسبِ معمول اخبار میں ضرورت رشتہ کا اشتہار پڑھ کر تمہارے والدین کو خط لکھوں گا اور جہیز وغیرہ کی کوئی قید نہ ہوگی اس لئے ہوسکتا ہے ہماری شادی ہو جائے۔ یوں تو سبھی کچھ ہوسکتا ہے لیکن اگر کچھ نہیں ہوسکتا تو یہ کہ تم بڑے مالدار والدین کی بیٹی ہو اور کسی روز اپنی نئے ماڈل کی کار میں مال روڈ سے گذر رہی ہو اور میں اچانک تمہاری کار کی لپیٹ میں آجاؤں۔ تم مجھے اٹھا کر اپنے گھر لے جاؤ اور جب میری آنکھ کھلے تو میں کبھی تمہیں اور کبھی تمہارے گھر کو دیکھ کر پھر آنکھیں بند کرلوں کہ مبادا میں وفات پا گیا ہوں اور اللہ میاں نے کسی نیکی سے خوش ہو کر مجھے جنت میں بھیج دیا ہو اور پھر ——

تمہاری افسانوی آنکھوں میں خوشی ناچنے لگے اسی طرح ہم ہر شام کسی ناچ گھر میں ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈال کر ناچتے رہیں اور ایک روز تم اپنے والدین کو نگنی کا ناچ نچا دو یعنی مجھ بھٹیچر ادیب سے بیاہ کرلو۔ اوہ! کتنا خوبصورت تصور ہے یہ!

مجھے تصورات کی نہیں بلکہ حقائق کی بات کرنا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ مجھ فاقہ کش ادیب کی حقیقت ہی کیا ہے جو ایسی ٹبر فلائیوں کی آرزو کروں جن کی عادت ہے کہ محبت ادیبوں سے اور شادی عہدوں سے کرتی ہیں۔

بات وہیں پہنچ جاتی ہے جہاں سے شروع ہوئی تھی تم کیا ہو کیسی ہو اور کہاں ہو۔ یہ نہ جانتے ہوئے بھی مجھے یقین ہے کہ تم ہو ضرور میں تمہارے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے یہ خط اس لئے لکھ رہا ہوں تاکہ جب چھپ جائے تو اسے سنبھال کر رکھ چھوڑوں اور جس روز تم سچ مچ میری بیوی بن جاؤ گی تو میں یہ خط تمہیں دے دوں گا کیونکہ شادی کے بعد ہمارے خطوں میں غالباً دھوبی کے تقاضوں اور بچوں کی بیماری کا ذکر ہوا کرے گا!

تو پھر اے میری ہونے والی بیوی!

امید ہے تمہاری الجھن دور ہو گئی ہو گی اور اب تم ایک سلجھے ہوئے دماغ والی سمجھدار لڑکی کی طرح میری باتیں غور سے سنو گی اگر یہ باتیں سننے کے بعد بھی تمہارا ارادہ مجھے خاوند بنانے کا ہو تو مجھے لکھ دینا لیکن خدا کے لئے اپنے خط میں مجھے "سرتاج من سلامت" نہ لکھنا کیونکہ

مجھے ایسی لڑکیاں ہرگز پسند نہیں جو اپنے سر پر تاج رکھتی ہوں۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ مجھے ننگے سر رہنے والی لڑکیوں سے لگاؤ ہے میں تو ان لڑکیوں کا شیدائی ہوں جو اپنے سروں پر دوپٹہ اوڑھے رہتی ہیں اور میں خود عموماً ننگے سر رہتا ہوں۔ دراصل میں بہت ننگا بھوکا آدمی ہوں۔

پیاری ہونے والی بیگم!

یہ تو تم بھی جانتی ہو کہ فی زمانہ تاش کے چار بادشاہوں کے سوا گنتی کے بادشاہ رہ گئے ہیں اس کے برعکس بیگمات کی تعداد میں کسی مفلس کی اولاد کی طرح اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ میں بیگمات اودھ سے شروع ہو کر ہر اس عورت کو اس خط کا موضوع بنا لوں گا جو محض بیگمی چاولوں کا ٹوٹا کھا کر بیگمات کہلاتی ہے اور یوں یہ بات تمہاری ذات تک پہنچ جائے گی۔

یقین جانو میں نے ذات پات کے بارے میں تو کبھی سوچنا بھی گوارا نہیں کیا۔ اس لئے مجھے یہ جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں کہ تمہاری ذات کیا ہے۔ یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے اور میں کسی کے ذاتی معاملات کی طرح اس کے ذاتی خطوط دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ خواہ وہ میری جائز منکوحہ بیوی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ بڑی ذات شریف نکلے

اور میں   سے بدذات کہنے پر مجبور ہو جاؤں

ان باتوں سے تم یہ ہرگز نہ سمجھنا کہ مجھے خدانخواستہ تمہارے چال چلن پر شبہ ہے۔ تم یقیناً ایک سگھڑ اور چلن دار بیوی ثابت ہو گی۔ رہ گئی چال کی بات تو سچ جانوں نہ میں چال چلتا ہوں نہ کسی کی چال میں آتا ہوں اور وہ چال جس کا اگر ایک بار ذکر چھڑ جائے تو بات تمہاری جوانی تک جا پہنچتی ہے۔ اس کے بارے میں تو کوئی غزل گو شاعر ہی غزال ختن کی رفتار کا استعارہ تلاش کر سکتا ہے یا پھر یوں کہ

؎ وہ قدم آج چل کے دکھلا دو
لوگ قائل نہیں قیامت کے

مجھے لوگوں سے کوئی سروکار نہیں میں تو سچے دل سے قیامت پر ایمان رکھتا ہوں اور تم جانو اس زمانہ میں ایماندار لوگوں کا کتنا فقدان ہے اور ایمانداری کی بات یہ ہے کہ تم سے کیا پردہ ہے پردہ تو میری عقل پر پڑا ہوا ہے جو پردہ سکرین پر جلوہ گر ہونے والی جادوگر بتوں کے تصور میں ایک عدو شادی کا ارادہ رکھتا ہوں میں نے پردہ سکرین کی بات یونہی نہیں کی اس کا پس منظر یہ ہے کہ مجھے اتفاق سے ایک فلم کے لئے چند مکالمے لکھنا تھے۔ انہی دنوں لاہور

کے نگارخانوں میں مجھے بہت سی زیر تکمیل فلمیں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ہر فلم کا محور کم و بیش شادی تھا اور اسی وجہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ شادی وطن عزیز کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ چنانچہ مجھے بھی اپنی شادی کا خیال آیا اور رفتہ رفتہ یہ خیال جنون کی حد تک پہنچ گیا۔

بظاہر میری شادی کا کوئی امکان نہیں پھر بھی میں نے سوچا کہ یہ خط لکھوں شاید اسے پڑھ کر کوئی لڑکی مہربان ہو جائے اور میرا بنیادی مسئلہ یعنی شادی طے ہو جائے۔ لیکن میری بنیاد بہت کمزور ہے نہ میرے بازو میں زور ہے نہ جیب میں زر اب اگر مجھے کوئی یہ شعر سنائے تو میں اس کا کیا بگاڑ سکتا ہوں کہ ؎

زور و زر پاس کچھ نہ تھا جو میرؔ
کس بھروسے پہ آشنائی کی

میں آشنائی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ کیونکہ میں اپنے ماضی سے اچھی طرح آشنا ہوں۔ میری پیدائش کا سانحہ مشرقی پنجاب کے ایک چھوٹے سے شہر میں پیش آیا تھا اور جب میں نے ہوش سنبھالا تو مجھے اپنے گردوپیش میں ایرانی قالین گدار بستر اور کشادہ گھر دکھائی دیا۔ ہر وقت لڑنے جھگڑنے والے پیارے بھائی بہن مہربان باپ اور اچھی ماں

کے علاوہ لاکھوں کی جائیداد، یہ تھا میرا ماضی جس میں جرمنی کے بھرے پہاڑوں کی برف اور معصوم آرزؤں کا جال سا بچھا تھا۔ پھر کون جانے کیسا زلزلہ آیا جو ہم لاہور پہنچ گئے۔ اب میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو میرے سامنے بجلیات کا دفتر تھا اور پیچھے ایک تاریک گھروندا جس میں مٹی کے تیل کا لمپ اونگھ رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن جب حالات کی تیز آندھی نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا تو میں مر چکا تھا اور میری خاک سے ایک ادیب کے خدوخال اُبھرنے لگے۔

اب اس حادثے کو گیارہ برس گزر چکے ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں وہ تمام لوگ نو دو گیارہ ہو چکے ہیں جو کبھی آشنائی کا دم بھرتے تھے۔ اچھا اب مجھے اخبار کے دفتر تک پیدل چلنا ہو گا۔ چلتے ہوئے میرے پرانے بوٹ آگے سے مگرمچھ کی طرح منہ کھولتے ہیں، اور میں کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ پانی میں رہتے ہوئے مگرمچھ سے بیر میرے بس کی بات نہیں۔

میں ہوں تمہارا

ہونے والا خاوند

○

بیانِ حلفی

آخرکار مجھے بھی ان لوگوں سے سابقہ پڑ گیا۔ جو بُت فروش کی بجائے بت شکن کہلانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ میں نے بت فروشی سے کبھی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ البتہ لائسنس فروشی سے قوم فروشی تک جملہ کاروبار مجھے زندگی بھر مرغوب رہے ہیں۔

پیارے عوام!

آپ سے میری جان پہچان بہت پرانی ہے پھر بھی میں کہوں گا کہ آپ مجھے جانتے تو ہیں لیکن پہچانتے ہرگز نہیں آپ نے برسوں اخباروں میں میرے بیان پڑھے ہیں لیکن آج میں ایک حلفی بیان دینا چاہتا ہوں کیوں میں فطرتاً بیان باز واقع ہوا ہوں اس لئے مجھے یہ بتا دینے میں بھی کوئی تامل نہیں کہ میں بیان بازی کے علاوہ نعرے بازی اور بازی بازی بار لیش بابا ہم بازی کا بھی ماہر ہوں۔ آپ ایک زمانہ تک میری تقریریں سننے کے لئے اپنے تاریک گھروندوں سے جلسہ گاہ تک آتے رہے۔

اور میں بھی سالہا سال رشوت پورہ سے موچی دروازہ کے باغ تک کا فاصلہ طے کرتا رہا۔ تاکہ آپ کو اپنے خیالات سے مستفید ہونے کا

موقع بہم پہنچاتا رہوں۔ آنے جانے کا یہ سلسلہ مدتوں جاری رہا۔ لیکن پچھلے چند روز سے میری زبان کو زنگ لگ گیا ہے کیونکہ ہر ایرا غیرا میری شان میں زبان درازی پر اتر آیا ہے اور مجھ پر پابندی عائد کر دی گئی ہے کہ میں کسی جلسہ گاہ میں جاکر تقریر نہ کرسکوں۔ موچی دروازہ کے باغ کو ویران دیکھ کر آج کل یہ مصرعہ مجھے اکثر یاد آتا ہے کہ ع

"رہی دونوں طرف سے بے لبسی نہ وہ آسکے نہ میں جا سکا"

آپ حضرات گزشتہ گیارہ برس تک بے لبسی کے عالم میں رہنے کے باعث اس کے عادی ہو چکے ہیں اور مجھ پر تو ابھی گیارہ ہفتہ بھی بے لبسی کے عالم میں پورے نہیں ہوئے اس لئے میرا دم گھٹنے لگا ہے اور ہر طرح کے دم درود کرانے پر بھی میرے دم میں دم نہیں آتا۔ اب بے لبسی کی بات چل نکلی ہے تو یہ بھی جان لیجئے کہ بے لبسی کا وقت وہ نہیں ہوتا جو بس کے انتظار میں گزارا جاتا ہے اور مجھے تو ویسے بھی اللہ کے فضل سے بس میں سوار ہونے کی تکلیف اٹھانا نہیں پڑتی کیونکہ میرے پاس سواری کے لئے نئے ماڈل کی ایک سے زیادہ کاریں ہیں۔ یوں تو مجھے سیاسی کارکنوں کے کاندھوں پر سوار ہونے کا چسکا رہا ہے۔ لیکن زیادہ تر میں ان لوگوں کے اعصاب پر

سوار رہا کرتا تھا جو میرے عزیزوں پر مہربانی کرنے سے کترایا کرتے تھے۔ یہ بات اور سن لیجئے کہ میں آج کچھ بھی کہنے سے نہیں کتراؤں گا آپ نے اکثر یہ بورڈ تو پڑھا ہوگا کہ جیب کتروں سے ہوشیار رہیئے پھر بھی اس حقیقت پر غور کرنے کی مہلت آپ کو نہیں ملی ہوگی کہ جیب کترے آپ سے زیادہ ہوشیار ہوتے ہیں اور انہوں نے اس فن میں اتنی ترقی کر لی تھی کہ صرف سینما کی کھڑکیوں پر جیب کترنا تو درکنار وہ گھر بیٹھے آپ کے پورے کنبہ کی جیبیں خالی کر دیتے تھے اور جب آپ کی جیب میں کچھ ہوگا ہی نہیں تو اسے کترنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ سوال یہ ہے کہ اگر آپ برا نہ مان جائیں تو میں کہدوں کہ آپ سب اصل میں میرے در پر سوالی بن کر آتے تھے۔ اور میرا دربان آپ کی ہی سہی پونجی بھی وصول کر کے آپ کو چند خوبصورت وعدے دیتا تھا اور آپ لوٹ جایا کرتے تھے۔ پیارے عوام آپ واقعی بہت بھولے ہیں جو محض خوبصورت وعدوں پر جیا کرتے تھے۔ آپ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ خوبصورت چیزیں دیرپا نہیں ہوتیں۔ پھر یہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ جھوٹ بولنے اور وعدہ توڑنے کیلئے ہوتا ہے۔

آج شام جب میں نے اپنی نئی کار میں گھر سے اس جلسہ گاہ

تک کا فاصلہ طے کیا۔ جہاں آپ لوگ جوق در جوق آیا کرتے تھے۔ تو میں نے سوچا کہ میری زندگی کی طرح یہ کار بھی اب چند روز کی مہمان ہے اور میں جو گلشن کے دنوں ہی بن بلائے مہمان کی طرح آپ کے ہاں حاضر ہونے سے نہیں اکتایا کرتا تھا۔ آج تھوڑا سا فاصلہ طے کرتے ہوئے اکتا رہا تھا۔ جب میں یہ طویل فاصلہ طے کر رہا تھا تو میں نے فیصلہ کیا کہ آپ کو صاف صاف بتاؤں گا کہ میرے دل اور زبان کے درمیان کتنا طویل فاصلہ ہے۔ اب یہ میرا آخر وقت ہے اس لئے محض اپنی عاقبت سنوارنے کے لئے سچی باتیں کر رہا ہوں۔ اسی وجہ سے میں نے ان باتوں کا نام بیان حلفی تجویز کیا ہے۔

سوا ے میرے پیارے عوام ——

میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر بیان کرتا ہوں کہ موچی دروازہ کے جلسوں میں آپ کی حاضری کا نظارہ کر کے میں دل ہی دل میں بہت ہنسا کرتا تھا کیونکہ مجھے بے پر کی اڑانے کا کافی تجربہ ہو چکا تھا اور آپ میری ہر بات کو برحق سمجھ کر ناحق نعرے لگایا کرتے تھے۔ آپ گلا پھاڑ پھاڑ

کر نعرۂ تکبیر کہا کرتے تھے اور میں خاموشی سے آپ کے گلے پر تکبیر پڑھ دیا کرتا تھا۔ اور ثواب دارین بھی حاصل کر لیا کرتا تھا کیونکہ مجھ پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح تھی کہ ع

"وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا"

اب ثواب کے دن گزر گئے ہیں اور عذاب کی کالی راتیں شروع ہو گئی ہیں۔ میں ان سیاہ راتوں میں آپ کو سیاہ بازاری کا قصہ سناؤں گا۔ سیاہ بازاری جسے انگریزی میں بلیک مارکیٹ کہتے ہیں۔ صرف میرے ہم پیشہ لوگوں کے دم قدم سے قائم تھی لیکن جب سے ایوان حکومت میں نئے حاکموں نے قدم رنجا فرمایا ہے۔ ہم لوگ اسی وقت سے دم سادھے بیٹھے ہیں ہیں نے جو اپنے ہم پیشہ لوگوں کی بات چھیڑی ہے تو اس میں بھی مصلحت ہے لیکن میں وعدہ کر چکا ہوں کہ جو کہوں گا خدا کو حاضر ناظر جان کر سچ کہوں گا اس لئے مصلحت کو چھوڑ یئے اصل بات یہ ہے کہ ہم لوگ جو چور بازاری کے معزز پیشہ کو فروغ دے رہے تھے تو یہ سب کچھ ایک باقاعدہ منصوبہ کی صورت میں کیا جاتا تھا۔ ہماری ایک خفیہ جماعت تھی اور اس کے صرف اکتالیس رکن تھے ہمارے سردار کا نام علی بابا ہے

لیکن افسوس کہ علی بابا پکڑا گیا ہے اور چالیس چور چھوڑ گیا ہے مجھے اعتراف کر لینا چاہیئے کہ میں بھی انہی چالیس چوروں میں سے ایک ہوں جو ادھر ادھر اپنی جان بچاتے پھر رہے ہیں اور بقول شاعر ع

"جان ہے تو جہان ہے پیارے"

پھر بھی مجھے بزرگوں کے اس قول سے خطرہ ہے کہ بکرے کی ماں کتنے دن خیر منائے گی۔ زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں۔ جہاں اخباروں کے کالم میرے ذکر سے خالی ہو گئے ہیں وہیں یہ بھی ممکن ہے کہ کل کلاں کو مجھے اپنا شاندار بنگلہ چھوڑ کر جیل کی فلک بوس دیواروں کو آباد کرنا پڑے۔ آباد کاری کے نام پر گیارہ سال تک آپ کو برباد کرتا رہا ہوں۔ لیکن آپ ہیں کہ ابھی تک برباد نہیں ہوئے حالانکہ میرے گھر بھر کا سکون برباد ہو گیا ہے۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ ع

"سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں"

مجھے قدرت سے زیادہ اپنے کارخانوں کی فکر دامن گیر ہے جن کے بھوکے ننگے کارکن اب زمین کی چھاتی پر یوں سینہ تان کر چلتے ہیں۔ جیسے کارخانہ کا مالک میں نہیں بلکہ وہ کم بخت ہیں۔ ویسے تو ہر چیز کا حقیقی مالک خدا ہی ہوتا ہے۔ لیکن آپ ہی انصاف کریں اگرچہ

میں نے کبھی انصاف نہیں کیا، کہ یہ ذلیل اور خانہ مست مزدور اپنے ماضی کو کتنی جلدی بھول گئے ہیں کل تک میری شکل دیکھ کر ان کی جان جاتی تھی اور آج یہ مجھے جن بھوت بن کر دیکھتے ہیں۔ سچ ہے انسان اپنے بُرے وقت کو یاد نہیں رکھتا۔ یہ وقت کی بات ہے کہ وقت میرے ساتھ نہیں۔ بُرے وقت میں کون کسی کا ہمدرد اور ساتھی ہوتا ہے دوستو! مجھے وہ زمانہ یاد ہے جب میں ایک معمولی کسان تھا اور میری پونجی محض دو گدھوں پر مشتمل تھی جن پر میں ملبہ ڈھو کر اپنے بچوں کا پیٹ پالا کرتا تھا۔ میرے پاس تھوڑی زمین تھی جو قیام پاکستان کے وقت سرحد کے قریب آگئی پھر میں نے اپنی ہمت اور محض اپنے حوصلہ پر گنھنہ کا کاروبار شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ یہ کام سونے چاندی کے بیوپار میں بدل گیا اور چند ہی برس میں اللہ نے مجھے لاکھوں کا مالک بنا دیا۔ یہ سب اللہ کے کرم اور میری ہمت کے طفیل ہوا۔ لیکن حاسد ول نے مجھے سمگلر کہنا شروع کر دیا۔ حاسد لوگ، جلتے رہے اور میں گنگناتا رہا کہ

"جلنے والے جلا کریں"

لیکن قسمت نے زیادہ دنوں تک میرا ساتھ نہ دیا۔ یہ تو آپ

جانتے ہی ہیں کہ میں نے صرف گیارہ برس میں معمولی کمہار سے کارخانہ دار اور اسمبلی کے ممبر تک بہت سے اعزاز حاصل کر لئے تھے اب مجھے امید تھی میں اللہ کے فضل و کرم سے وزیر بھی بن جاؤں گا اس سلسلہ میں میں نے پچھلے دنوں لاکھوں روپے صرف کئے تھے مگر افسوس کہ وزارت کے شوق میں بنوائی ہوئی شیروانیاں کھونٹیوں پر ٹنگی رہ گئیں اور اچانک پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی۔ ساری سیاسی جماعتوں کی طرح ہماری پارٹی کا دفتر بھی سر بمہر کر دیا گیا اور میری نقل و حرکت پر خفیہ پولیس متعین کر دی گئی۔ وہ اخبارات جن کی پیشانی پر میرے بیانوں کی سرخیاں جمتی تھیں یکایک میرے ذکر سے بھی گریزاں ہو گئے اور میں ذکر اللہ میں مشغول ہو کر سوچ رہا ہوں کہ ع

"جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا"

مجھے زندگی بھر بتوں سے کوئی رنج نہیں ملا تھا۔ کیونکہ بعض ناسمجھ لوگوں کے خیال کے مطابق میں خود بھی ایک بہت بڑا بت ہی تھا اور اب وہ بریدہ ذہن لوگ کہتے پھرتے ہیں کہ آخر کار مجھے بھی ان لوگوں سے سابقہ پڑ ہی گیا جو بت فروش کی بجائے "بت شکن" کہلانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں نے

بت فروشی سے کبھی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا البتہ لائسنس فروشی سے قوم فروشی تک جملہ کاروبار مجھے زندگی بھر مرغوب رہے ہیں

اور یہی وہ دھندے تھے جن کی بدولت میں نے اتنی دولت پیدا کی کہ میرے لڑکے انگلستان میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور لڑکیاں روم کی درسگاہوں میں اداکاری کا فن سیکھ رہی ہیں۔ آپ اداکاری کی بات سن کر حیران ہونے کی کوشش نہ کریں۔ مجھے خود بھی اداکاری سے برسوں شغف رہا ہے اور یہ جو تقریریں وغیرہ میں کیا کرتا تھا تو یہ سب محض اداکاری ہی تھی۔ کاشتکاری سے اداکاری تک کے کٹھن مرحلے میں نے کس طرح طے کئے یہ بتانے کا اب وقت نہیں رہا۔ اب تو آپ یہی جان لیں کہ میں نے اپنی جان پر کھیل کر یہ لاکھوں کی جائداد بنائی تھی جو اب خاک ہوتی جا رہی ہے میں جو برسوں آپ کی آنکھوں میں خاک جھونک کر صبا کے جھونکوں کی طرح بلندیوں کی طرف پرواز کرتا رہا۔ آج پھر زبردستی زمین کی پستی میں کھنچا جا رہا ہوں اس کھینچا تانی میں میرا تن کر کھڑے رہنا دشوار ہی نہیں ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے کبھی کسی بات کو ناممکن نہیں جانا۔ لیکن آج میں جان کنی کے عالم میں ان کانوں پر آنسو بہا رہا ہوں جو سونا اگلتی ہیں۔ اور خون

نگلتی ہیں۔

پیارے عوام!

میں آپ سے رخصت ہونے سے قبل اعتراف کر لینا چاہتا ہوں کہ میں نے ہمیشہ بے کسوں اور مجبوروں کا خون پیا ہے لیکن آج یہ سوچ کر میرا خون خشک ہو رہا ہے کہ میرے رشتہ داروں کا خون سفید ہو گیا ہے کیونکہ وہ لوگ سن سنتالیس کے خون خرابہ کی ذمہ داری بھی مجھ پر عائد کر رہے ہیں حالانکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ ان کی طرح میں نے بھی لوٹ مار میں تھوڑا بہت حصہ لیا تھا اور انہیں ان کے حصہ سے بھی زیادہ گائیں بھینسیں دی تھیں پھر وہ لوگ دودھ میں پانی ملانے کا کاروبار کرتے رہے لیکن افسوس کہ آج دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا ہے اور میں یہ سوچ کر پانی پانی ہوا جا رہا ہوں اگر مجھے کالے پانی کی سزا نہ بھی دی گئی تو اپنے پرانے گدھوں پر سوار کرا کے آپ کے حضور میں پیش کر دیا جائے گا۔

میں ہوں
آپ کا مخلص نمائندہ

○

۱۷ر دسمبر ۵۹ء

اک برہمن نے کہا ہے

غالب سے کسی برہمن نے کہا تھا کہ یہ سال اچھا ہے اور وہ سوچنے لگا تھا کہ ع
"دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض"
لیکن موجودہ زمانے کے بت سخت بے فیض واقع ہوئے ہیں اور پیشین گوئیاں کرنے والے برہمن یہ سرزمین چھوڑ کر جا چکے ہیں۔

برسوں پہلے کی بات ہے غالب سے کسی برہمن نے کہا تھا کہ یہ سال اچھا ہے اور وہ سوچنے لگا تھا کہ ع

"دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض"

لیکن موجودہ زمانے کے بت سخت بے فیض واقع ہوئے ہیں اور پیشین گوئیاں کرنے والے برہمن یہ سرزمین چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ اب جو لوگ ان کے جانشین مقرر ہوئے ہیں ان کا ذکر کرنے سے بہتر ہے کہ میں نئے سال کی بات کروں۔ نئے سال کی بات پرانے کوٹ سے شروع ہوتی ہے اور نئی کیڈلاک پر ختم ہو جاتی ہے پرانے کوٹ اور نئی کار کے درمیانی فاصلے میں ماضی کے دس برس ایک دوسرے کے پیچھے گردن جھکا کر گزر رہے ہیں۔ میں آپ کو دس برس

کے شب و روز کا افسانہ نہیں سناؤں گا مجھے حقیقت کی بات کرنا ہے اور حقیقت چونکہ اکثر تلخ ہوتی ہے اس لئے اگر آپ میری بات سن کر بُرا سا منہ بنائیں گے تو مجھے تعجب نہیں ہوگا۔

آج کے دن ہماری زمین نے سورج کے گرد ایک اور چکر مکمل کر لیا ہے اور زمین کے باشندے ایک اور چکر میں آ گئے ہیں۔ دنوں اور راتوں کے اس لامتناہی سلسلہ کی کڑیاں جب عوام تک پہنچتی ہیں تو زنجیریں بن جاتی ہیں۔ زنجیروں کی بات تو بہت گھسی پٹی ہے البتہ عوام بھی دس برس سے "گھسنے" اور "پٹنے" کے باعث روپوش ہو گئے ہیں اب حالت یہ ہے کہ ہر سیاسی جماعت کے رہنما گلا پھاڑ پھاڑ کر اعلان کرتے پھر رہے ہیں کہ "اصلی تے وڈے" عوام ہمارے ساتھ ہیں جب کبھی کسی لیڈر کو جلسہ عام سے خطاب کرنا ہوتا ہے تو سیاسی کارندے عوام کی تلاش کے سلسلہ میں بڑی گرم جوشی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اس گرم جوشی کا آغاز پاکستان کے پہلے صوبائی انتخابات سے ہوا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب مادام مسلم لیگ کے عشوہ و انداز کا بازار گرم تھا اور اب موصوفہ کی آخری قیام گاہ کے دروازے پر گرم حلیم فروخت ہوتا ہے ہاں تو جب انتخابات ہونے تو "جھرلو" اور "کھمبے" کی صنعت

نے بہت فروغ پایا تھا کھمبوں کو ٹکٹ دیا جاتا تھا اور جھرلو کی مدد سے انہیں کامیاب کرا لیا جاتا تھا پیارے قارئین۔ جھرلو تو ایک زمانہ سے دیکھنے میں نہیں آیا البتہ کھمبے آج بھی ایوانِ حکومت کے راستہ میں سینہ تان کر کھڑے ہیں اور ان کی نیلگوں روشنی میں کولمبو پلان کے تحت آنے والی کاریں تیرتی پھر رہی ہیں، اور میں بیکار ہونے کی وجہ سے سال بھر فٹ پاتھوں پر پیدل گھومتا رہا ہوں اور اب نیا سال شروع ہوا ہے تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ برہمن نے کیا کہا ہے حضرات سچی بات تو یہ ہے کہ برہمن نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔ اگر آپ چند لمحوں کے لئے مجھی کو برہمن مان لیں تو میں آپ کے نام نئے سال کا پیغام بھیجنے کی جسارت کر لوں گا تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے، حالانکہ یہ دنیا ایسی ہے جہاں وقت پر کچھ بھی کام نہیں آتا اور وہ روایتی گدھے اب چالاک ہو گئے ہیں جنہیں وقت پر باپ بنانے کے کام میں لایا جا سکتا تھا۔ پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ آپ کے کام آجاؤں اور ان لوگوں کے جملہ حالات لکھ ڈالوں جو نئے سال کی خوشی میں کام ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ رہ گئی یہ بات کہ نئے سال کے بارے میں برہمن نے کیا کہا ہے تو عرض ہے کہ مجھے برہمن تسلیم کرنے پر آپ شاید آمادہ نہ ہوں گے اس لئے میں آپ کو سچی بات بتانے پر مجبور ہوں سچی بات یہ ہے کہ ایک

برہمن نے یہاں سے جاتے ہوئے مجھے آنے والے تمام سالوں کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا اور اب آپ کو بتا دیا جائے گا۔ سب سے پہلا نیا سال وہ تھا جب دنیا کے نقشہ پر پاکستان کا اضافہ ہوا تھا۔ افراتفری کا زمانہ تھا لٹے پٹے مہاجر سر چھپانے کو جگہ ڈھونڈتے پھر رہے تھے اور افسر بحالیات کے کمرے میں مفکرِ ملت کا یہ شعر لکھا ہوا تھا کہ ؎

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

قصرِ سلطانی کا گنبد بہت بلند ہے اور اس پر بسیرا کرنے کی جرأت تو درکنار میرے جیسا آدمی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ رہ گیا شاہیں تو اسے آپ میری بدقسمتی سمجھ لیجئے کہ مجھے اس نام کے کسی پرندے سے شرف نیاز حاصل نہیں البتہ میرا مولا بھی بڑا بے نیاز ہے جو اپنے ان نیاز مندوں پر بہت مہربان ہے جو ایک زمانہ تک قوم کے مزار پر نیازیں کھاتے رہے ہیں ہیں نے مرمریں گنبدوں پر بسیرا کرنے والے کبوتر ضرور دیکھے ہیں۔ بوسیدہ مکانوں کی منڈیروں پر پھڑ پھڑانے والے کبوتروں کو شاید شاہیں ہضم کر گئے ہیں میرا ہاضمہ بے حد خراب ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے ہضم کرنے کا راشن بھی مشکل سے ہی ملتا ہے۔ آج سے دس سال پہلے جب

میں نے راشن کے دفتر کا رخ کیا تو وہاں لکھا تھا کہ ؎

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی

جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

پیارے پڑھنے والو! راقم الحروف بھی ایک مہاجر کی حیثیت سے پاکستان میں آیا تھا۔ اس لئے مجھے اعتراف کر لینا چاہیئے کہ میرا طائر لاہوتی رزق کی تلاش میں آسمان کی بلندیوں تک پرواز کرنے کے بعد زمین کی پستیوں پر اُتر آیا ہے لہذا اسے دونوں وقت بہت زور کی بھوک لگتی ہے۔ صبح اٹھتے ہی چائے ٹوسٹ اور انڈے مانگتا ہے گولڈ فلیک کے سگریٹ پیتا ہے اور رزق کی تلاش کرتا ہے جو آسمانوں پر نہیں ملا لیکن حضرات کتنے افسوس کا مقام ہے کہ میرے طائر لاہوتی کو زمین پر بھی بدستور رزق کی تلاش ہے شاید میرے رازق کی یہی مرضی ہے اپنے رازق کا ذکر کرتے ہوئے مجھے محکمہ خوراک کے حکام کا خیال نہیں آتا۔ مجھے اس نئے سال کا خیال آرہا ہے جو بیس سال پرانا ہو چکا ہے۔ یہ بات مکان کی ضرورت سے شروع ہوئی تھی چنانچہ جب کسی صورت مکان حاصل نہ ہوا تو میں نے اپنی صورت حال کا جائزہ لیا اور فیصلہ ہوا کہ مجھے قسطوں پر مکان خرید لینا چاہیئے اس سلسلہ میں امپرومنٹ ٹرسٹ کے دفتر جانا ہوا جہاں لکھا تھا کہ ؎

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں

کہ شاہیں کے لئے ذِلّت ہے کارِ آشیاں بندی

بات صرف اتنی ہے کہ مجھے شاہیں ہونے کا دعویٰ ہرگز نہیں پھر بھی مجھے نہ مکان ملا ہے نہ روزگار۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وطنِ عزیز میں مجھ صحافی کو زبردستی شاہیں کی صفات پیدا کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے اور میں ایک تاریک سے کمرے میں زندگی کے دن پورے کر رہا ہوں۔ دراصل اس کمرے میں زندگی بھی اپنے دن ہی پورے کر رہی ہے اور اب اس سال کے تمام دن پورے ہو چکے ہیں۔ آج کی رات کے بعد نیا سال شروع ہو جائے گا۔ یہ رات جب مال روڈ کے ریستورانوں سے ہوتی ہوئی اونچے دروازوں والے کلبوں میں داخل ہو گی تو رنگ برنگی روشنیوں میں اسے الوداع کہہ دیا جائے گا۔ اس کے بعد نئے سال کی پہلی صبح طلوع ہو گی اس صبح سے مجھے پچھلے برس کی پہلی صبح یاد آ گئی جب شہر بھر کی دیواروں پر لکھا ہُوا تھا۔

مسلمانو! سن ستاون کو یاد رکھو

میں نے سال بھر سن ستاون کو یاد رکھا ہے لیکن سن ستاون نے مجھے یاد رکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی بہرحال اب میں توقع رکھتا ہوں

کہ اس سال یہ اشتہار دیکھنے میں آئے گا۔

مسلمانو سن سنامن کو بھول جاؤ

یاد رکھنے اور بھول جانے کا فلسفہ کچھ عجیب ہی سا ہے جسے یاد رکھو وہ بھول جاتا ہے جسے بھلاؤ وہ یاد آنے لگتا ہے اگر میں بہت بڑا گلوکار یعنی گویا ہوتا تو اس وقت آپ کو وہ گانا سناتا

یاد نہ کر دلِ حزیں بھولی ہوئی کہانیاں

آواز کا جادو آپ کو مسحور کر لیتا۔ اب میرے سر پر چڑھ کر بولنے والا جادو روٹی کا جادو ہے۔ نئے سال کے لئے کپڑوں کا طلسم ہے۔ اس ہوش ربا گرانی کے دور میں کپڑے کی دکانیں طلسم ہوشربا کے باب بنی ہوئی ہیں۔ جہاں سے نکلنے کے بعد لوگ عموماً رفوگروں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یا امریکی عطیات کی گانٹھیں دیکھتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی اور اس وقت دنیا کو نئے سال کا سفر درپیش ہے۔ دنیا کے باشندے پرانے کوٹوں کی دکان سے نئے ارادے لے کر نکلے ہیں اور برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

میں نہیں جانتا کہ ہر سال کے بارے میں اچھا ہونے کی

پیشین گوئی کیوں کر دی جاتی ہے۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ پرانے مسائل ابھی ختم نہیں ہوتے کہ نیا سال نئے مسائل کو جنم دے دیتا ہے۔ پرانے مسائل میں نہری پانی، کشمیر، مہاجرین، تعلیم خوراک اور رہائش چند ایسے سوالیہ نشان ہیں جو ہر سال نمایاں ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ باتیں قومی نوعیت کی ہیں۔ مجھے ذاتی مسائل سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے، اور یہ مسائل دوچار نہیں بلکہ ہزاروں ہیں اور ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے اور سڑکوں پر نرگس کے پھول بکنے لگتے ہیں اور لاہور میں وہ موسم آگیا ہے جسے بہار کہتے ہیں۔ لیکن نرگس کے پھولوں کی بہار صرف مال روڈ کی فضاؤں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ ان حدود سے پرے جہاں میں رہتا ہوں وہاں شیشے کے لیمپ کی مدھم روشنی ہے۔ سردی سے مرنے والوں کی داستانیں ہیں اور یوم لحاف کے انتظار میں کھلی رہنے والی آنکھیں ہیں اور یہ انتظار ہے کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے۔

مذکورہ مصرع کے ساتھ میرے ذہن میں ممتاز صاحب کی تصویر گھوم گئی ہے جو لگے وقتوں کا کوٹ اور اس کی جیب میں لگے

کے سگریٹ لئے پھرتے ہیں انہوں نے انار کلی میں ایک پرانا امریکی سوٹ دیکھ کر کہا تھا کہ مجھے اسے خریدتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کیوں کہ اگر اس ملک کے عوام ایسے کپڑے پہنتے ہیں تو اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ ہم ہی پہنتے ہیں اور اب جب کہ اس سال کی آخری رات ختم ہونے والی ہے تو میں آپ کو ندکورہ برہمن کی پیشین گوئی سنانے کے ارادے باندھتا ہوں، سوچتا ہوں اور پھر توڑ دیتا ہوں کہ کہیں کچھ "ایسا ویسا نہ" ہو جائے۔ اس خطرہ کے پیشِ نظر میں برہمن کی بات بتانے سے گریز کرتا ہوں اور مشورہ کے طور پر درخواست کرتا ہوں کہ آپ نئے سال کے بارے میں ریڈیو سے پیغامات سنیئے۔ کاروباری فرموں کے اشتہار پڑھئے اور نائٹ کلبوں سے کوچہ لیلےٰ مجنوں تک جو کچھ بھی ہو رہا ہے خود دیکھئے اور مجھے معاف کر دیجئے کہ میں نے وہ باتیں نہیں کہیں کیوں کہ :۔

بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

○

ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور ۵ رجنوری ۶۵۸

رونے کا فن

اے میرے قارئین جان لیجیے کہ رونے کی خاص خاص قسمیں یہ ہیں

○ گھریلو رونا ○ خاندانی رونا ○ ادبی رونا

○ فلمی رونا ○ سیاسی رونا ○ رومانی رونا

○ اور جنسی رونا ○

وہ جو کسی نے کہا ہے کہ گانا اور رونا کون نہیں جانتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ جانتے تو بھی ہیں البتہ ان کے قاعدے جاننے والا سوائے میرے شاید ہی کوئی ہو اور میں ایک ایسا شخص ہوں جو ہمیشہ آپ کو ہر بات بتا دیتا ہے چنانچہ آج بھی میں یہی بتانے کے لئے حاضر ہوا ہوں سب سے پہلے یہ جان لینا چاہیئے کہ گانا میں نہیں جانتا۔ البتہ رونے کے فن سے کسی حد تک ضرور واقف ہوں رونا کئی قسم کا ہوتا ہے ایک قسم وہ ہے جو گانے سے ملتی جلتی ہے اور یہ تمیز کرنا دشوار ہے کہ ہم گانا سن رہے ہیں یا رونا؟ اس کی مثال کے لئے آپ کو قیام پاکستان سے پہلے کا زمانہ ذہن میں لانا ہوگا۔ ان دنوں ہندوؤں کے محلوں میں آپ نے سیاہ گھاگھرے پہنے ہوئے ایسی دیویوں کو ضرور دیکھا ہوگا جو عموماً ایک

وفد کی شکل میں راستوں میں کچھ گاتی کچھ روتی ہوئی ایسے گھروں کی طرف جایا کرتی تھیں۔ جہاں کوئی مر گیا ہو۔ یہ رونا سر تال کے لحاظ سے اتنا مکمل اور جامع ہوتا تھا کہ ماتم کی تھاپ کی وجہ سے گانے اور رونے میں بہت کم فاصلہ رہ جاتا تھا۔

ایک رونا مدھم سروں میں رویا جاتا ہے ایسا رونا آپ نے اپنے پڑوسی کے ہاں رات گئے سنا ہوگا۔ اس رونے کی قابل ذکر صفت گھٹی گھٹی پر اسرار ہچکیاں ہوتی ہیں۔

ایک رونا وہ ہوتا ہے جو لڑکیاں اپنی سہیلی کو وداع کرتے وقت روتی ہیں اس رونے میں دکھ سے زیادہ حسرت کا عنصر شامل ہوتا ہے اور کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ اس طرح رونے کا مقصد سہیلی کی جدائی کا غم ہوتا ہے یا خود اس سعادت سے محروم رہنے کا دکھ میرا خیال ہے آپ اس طرح میرا ساتھ نہیں دے سکیں گے اس لئے بہتر ہوگا اگر میں رونے کی اقسام گنانے کے بعد گفتگو کا آغاز کروں۔ تو لیے میرے پیارے قارئین جان لیجئے کہ رونے کی خاص خاص قسمیں یہ ہیں۔

○ گھریلو رونا ○ خاندانی رونا ○ ادبی رونا ○ فلمی رونا ○

○ سیاسی رونا ○ رومانی رونا ○ جنسی رونا ○

گھریلو رونا

یہ رونا دراصل بہت سے رونوں کا مرکب ہے صبح سویرے ننھے بچے جب دودھ کے لئے روتے ہیں تو میاں بیوی اس وقت پر رونے لگتے ہیں جب ان کی شادی ہوئی تھی اسی وقت دودھ والا بل کے لئے روتا ہے یہ اور اسی قسم کے دوسرے جھگڑوں کو ملا کر گھریلو رونے کا مرکب تیار ہوتا ہے گھریلو رونا عموماً اندرون شہر کے تاریک مکانوں میں فروغ پاتا ہے اور کبھی کبھی شہر کے فلک بوس دروازوں سے نکل کر سرخ چھتوں والے بنگلوں کی طرف بھی چلا جاتا ہے۔

خاندانی رونا

یہی ایک رونا ہے جس میں آنکھیں نم نہیں ہوتیں اور نہ یہ گانے کی ضرورت رہتی ہے کہ ع

آنکھ بھر آئی دل بھر آیا

خشک آنکھوں کے ساتھ اپنے آباؤاجداد کی شاہانہ عظمت کا

ذکر کرتے ہوئے اچانک سوگوار ہو جانے کو خاندانی رونا کہتے ہیں اس مرض کا شکار عموماً مہاجر اور اقتصادی بدحالی میں مبتلا لوگ ہوتے ہیں میرے وطن میں ایک شہزادہ صاحب تھے ان کے دادا افغانستان کے بادشاہ تھے جو اپنی سلطنت سے محروم ہو کر وہاں آباد ہو چکے تھے دو پشتوں کے بعد سرمایہ ختم ہو چکا تھا۔ اور صرف نام کی حد تک شہزادگی باقی رہ گئی تھی۔

شہزادہ صاحب ذرا چانڈو سے شوق فرمایا کرتے تھے اور چانڈو خانے کی ایک مخصوص اینٹ پر بیٹھ کر چانڈو کا دم لگاتے تھے ایک روز ان کی جیب خالی تھی لہذا انہوں نے خاندانی رونا رو کر اپنے ایک خادم سے چونی لی اور تخت کابل کی قسم کھا کر وعدہ کیا کل واپس کر دیں گے چونی حاصل کرنے میں انہیں دیر ہو گئی تھی اس لئے دیر سے چانڈو خانے پہنچے اور وہاں دیکھا کہ ان کی اینٹ پر ایک اور شخص بیٹھا تھا اس پر شہزادہ صاحب کو طیش آ گیا، اور انہوں نے غصہ سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"گستاخ چانڈو باز تیری یہ مجال تو شہزادہ کی اینٹ پر بیٹھا ہے"۔

چانڈو باز نے کہا شہزادہ یہ چانڈو خانہ ہے۔ آپ کا محل نہیں

یہاں جو پہلے آیا بیٹھ گیا۔ اب میں یہاں سے نہیں اٹھوں گا اور اگر مجھے اٹھانا ہے تو چونی دینی پڑے گی شہزادہ کو نشہ کی ٹوٹ ستا رہی تھی۔ چنانچہ تھوڑی دیر تک شہزادہ سوچتا رہا۔ پھر جیب سے چونی نکال اس کی طرف پھینک دی اور چانڈو باز اینٹ خالی کر گیا شہزادہ نے اپنی اینٹ کو فخر سے دیکھا۔ اس پر تھوڑی دیر تک بیٹھا اور دامن جھاڑ کر چانڈو خانہ سے بغیر نشہ کے نکل گیا۔ اس واقعہ کو بھی خاندانی رونا کی تفصیل کے طور پر قبول کر لیجئے۔

ادبی رونا

وہ ہوتا ہے جو شبنم کی طرح نہیں رویا جاتا بلکہ رونے والا اگر رونے پہ آجائے تو دریا بہا دیتا ہے اس رونے میں محبوب کی بے وفائی پر آنسو بہائے جاتے ہیں۔ فلک ناہنجار کی وجہ سے پلکوں پر موتی لہرائے جاتے ہیں محبوب سامنے ہو تب رونا وہ چلا جائے تب رونا وہ ملتفت ہو پھر رونا وہ ستم ڈھائے پھر رونا۔ ادبی رونا تو آپ جانیئے دن رات میں ہر وقت اوڑھنا بچھونا رونا بن جاتا ہے اس لئے اس سے بچنے میں بہتوں کا بھلا ہوگا۔

فلمی رونا

تیز روشنی میں گلیسرین کے آنسو ڈال کر رونی صورت بنائی جانے تو اسے فلمی رونا کہتے ہیں۔

سیاسی رونا

اسے کہتے ہیں جو آج کل ماوام مسلم لیگ صاحبہ روتی ہیں۔ بعض خطیب سرِ ممبر آنسو بہا کر چندہ اور ووٹ حاصل کر لیتے ہیں کچھ لیڈر ایسے ہوتے ہیں جو قوم کا نام لے کر روتے ہیں اور شیروانی کی جیب میں لائسنس پرمٹ اور الاٹمنٹیں ڈالتے جاتے ہیں۔

رومانی رونا

وہ ہوتا ہے جو ندیوں، آبشاروں اور چشموں کے علاوہ ویرانوں میں رویا جاتا ہے۔ لڑکے یہ رونا ان مقامات پر بھی روتے ہیں جہاں محبوب سے ملنے کا وقت مقرر ہو۔ فلموں میں جب ہیرو اپنے محبوب کے غم میں گانا گانے لگتا ہے اس وقت ہال میں بیٹھے ہوئے تماشائی

جو رونا روتے ہیں اسے بھی رومانی رونا کہا جاتا ہے

یہ رونا مہذب خواتین جب اپنے آشناؤں کی کاروں سے نکل کر غسل خانوں اور خواب گاہوں میں پہنچتی ہیں اس وقت رویا کرتی ہیں۔

جنسی رونا

جنسی رونا صرف "جنسی یتیم" روتے ہیں۔ یا پھر ایسی بیویاں جن کے خاوند سمندر پار جاکر شادی رچا لیتے ہیں۔ اِس رونے کی مزید تفصیلات زبانی عرض کی جاسکتی ہیں۔

رونے کے فائدے

گھریلو رونا رونے کا فائدہ یہ ہے کہ اگر آپ کی جیب میں پیسے ہیں تو گھریلو رونا رویئے انشاء اللہ آپ کو قرض دینے سے نجات حاصل ہو جائے گی انتہائی مجرب نسخہ ہے آزمائش شرط ہے۔

ادبی رونا رونے سے ادیب فاضل کا امتحان پاس کرنے

میں آسانی رہتی ہے مشاعرہ کے ٹکٹ فروخت کرنے کے سلسلے میں یہ رونا بہت کام آتا ہے اور اپنے تئیں زبردست ادیب ثابت کرنے میں تو ادبی رونے کا جواب ہی نہیں۔

فلمی رونا فلمی اداکار بننے کے سلسلہ میں بہت مفید رہتا ہے۔ اگر آپ فلم پروڈیوسر ہیں تو اپنی ناکام فلم کا نام لے کر آنسو بہائیے خدا نے چاہا تو آپ کو ایک اور ناکام فلم بنانے کے لئے سرمایہ ہاتھ آجائے گا۔

سیاسی رونا رو کر دنیا بھر کے کام نکالے جا سکتے ہیں، ووٹ سے نوٹ تک جتنی ضروریات کسی سیاسی مریض کو پیش آسکتی ہیں ان سب کا کفیل یہ ایک رونا ہوگا۔ لیکن جیل میں جا کر سیاسی رونا بہت نقصان دہ ثابت ہوتا ہے وہاں رونے سے بہتر ہوگا اگر گانے سے شوق فرمایا جائے۔

جنسی رونا اسی صورت میں فائدہ مند ہوتا ہے جب کہ والدین کی رائے میں آپ نالائق واقع ہوئے ہوں اور وہ آپ کی شادی کرنے پر رضامند نہ ہوں ایسی صورت میں اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے سوتے جاگتے ہر وقت اور ہر جگہ جنسی رونا روتے رہیئے۔ چند دنوں کے بعد

شادی کی تاریخ مقرر ہو جائے گی۔

رومانی رونے کے بھی بہت سے فائدے ہوں گے جو مجھے اتفاق سے معلوم نہیں اس لئے اس سلسلے میں واقفیت حاصل کرنے کے لئے آپ کو کسی پیشہ ور عاشق سے رجوع کرنا چاہیئے۔

اب سنیئے کہ چھوٹے بچوں کو رونے کا یہ فائدہ پہنچتا ہے، کہ انہیں وقت پر دودھ مٹھائی اور کھلونے مہیا ہو جاتے ہیں نوجوانوں کو رونے کا فائدہ اس طرح پہنچتا ہے کہ والدین انہیں روتے دیکھ کر اچانک مہربان ہو جاتے ہیں۔ بوڑھوں کے رونے سے خود سر اور ضدی اولاد دوبارہ سعادت مندی کے موڈ میں آجاتی ہے بیوی کے رونے سے خاوند اس کی فرمائشیں پُوری کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ خاوند کے رونے سے بیوی لپ اسٹک اور پاؤڈر کا استعمال کم کر دیتی ہے اور شاعر کے رونے سے ــــ اچھا اِسے جانے دیجئے۔ اب میں میر کا ایک شعر سنا کر رخصت چاہوں گا۔ یہ شعر آپ نے سنا ہو گا لیکن غلط مشہور ہو جانے کی وجہ سے اصل شعر آپ پہلی بار سنیں گے

سرہانے میر کے آہستہ بولو
نہیں تو اُٹھ کے یہ رونے لگے گا

(اردو پریس ۸۸ میکلوڈ روڈ — لاہور)

طباعت سرورق نوروز پریس، اردو بازار لاہور